عبداللہ حسین

قید

فہرست

باب اول
گرمیوں کی ایک رات کا جادو 9

باب دوئم
موضع رکھوال کے دو دوست 25

باب سوئم
سلسہ کرامتیہ کی کہانی 43

باب چہارم
سلامت علی کی واپسی 59

باب پنجم
تین قتلوں کی حکایت 73

اختتامیہ
رسم چہلم کا منظر 107

باب اوّل

گرمیوں کی ایک رات کا جادو :۔

پہلی بار جب بچے نے اپنے باپ کے حُجرے میں جھانک کر دیکھا تو اُس وقت وہ نو برس کی عُمر کا تھا ۔ اُس رات کا منظر سالہا سال تک اُس کے ذہن پر نقش رہا ۔

رات آدھی گُزر چکی تھی مگر لُو رُکنے کا نام نہ لیتی تھی، لگتا تھا جیسے دُنیا کی دوسری جانب کسی ریگستان پہ سُورج چمک رہا ہے اور تپتی ہوئی ہوا وہاں سے سیدھی اِس گاؤں کا رُخ کر رہی ہے ۔ گھر کے وسیع صحن میں دو مچھر دانیاں لگی تھیں ۔ یہ موٹے موٹے روغنی پایوں والے نواڑی پلنگ تھے جن پہ بچہ اور اُس کی ماں سفید جالی کے پردوں میں محفوظ سوئے پڑے تھے ۔ اِن سے ذرا ہٹ کر مزید تین چارپائیاں بچھی تھیں ۔ یہ موٹے بان کی تنگی چارپائیاں تھیں جن پہ گھر کا کام کاج کرنے والی لڑکیاں گرمی اور محنت سے بے دم ہوکر بیہوش کی نیند سو رہی تھیں ۔ لڑکیوں کے ہاتھ پاؤں ، بازو اور ٹانگیں، گردنیں اور سر ایسے آڑے زاویوں پہ مُڑے پڑے تھے کہ جیتے جاگتے بدنوں پہ ناممکن نظر آتے ۔ ان کی موٹی ململ کی ٹخنے دار شلواریں اِکٹھی ہو کر گھٹنوں تک اور باریک قمیصیں آدھے آدھے پیٹ تک اُوپر سرک آئی تھیں ۔ گو وہ گہری نیند میں تھیں مگر دن بھر کی تکان اور تپش کے مارے مُستقل بے آرامی سے کروٹیں بدل رہی تھیں ۔

2009/08/23 13:53

اِن چارپائیوں کے علاوہ صحن کے کونے میں دُور جہاں نلکا لگا تھا ایک چارپائی الگ تھلگ پڑی تھی جِس کے اُوپر ایک کُبڑی سی سیاہ شبیہہ نظر آرہی تھی ۔ یہ مائی سروری تھی جو اپنی گدڑی کا خیمہ بنائے اُس کے اندر اکڑوں بیٹھی تھی ۔ اِس بلا کی گرمی میں بھی جب کپڑے کی صورت دیکھتے ہی جی گھبرانے لگتا تھا، مائی سروری گدڑی سر سے نہ اُتارتی تھی ۔ سردی ہو یا گرمی ، وہ گدڑی کے خیمے کے نیچے دِن رات رُو پوش بیٹھی رہتی تھی ۔ کھانے کے وقت سب نے پہلے اُس کا کھانا نکلتا اور لڑکی برتن لے جاکر گدڑی کے باہر چارپائی پہ رکھ کر واپس چلی آتی ۔ مائی سروری دو دو، تین تین روز کھانے کو مُنہ نہ لگاتی ، پھر ایک وقت ہاتھ گدڑی سے باہر نکال کر برتن اندر کھینچ لیتی اور کھا کر خالی برتن باہر دھکیل دیتی ۔ تاہم کھانے کا یہ دستور ایسے خدائی قانون کے مطابق گھر میں چلتا تھا کہ ایک پہر کا ناغہ بھی کسی کے تصور میں نہ آتا تھا ۔ وقت کے وقت کھانا اُس کی چارپائی پہ پہنچتا ، اور وقت نکل جانے پہ ویسے کا وَیسا اُٹھ جاتا ۔ یہ سب کے دیکھے کی بات تھی کہ گھر کی پالتو تین بِلّیاں اور دو کُتّے ، اور ٹکڑوں کی آڑ لگائے بیٹھے ہوئے کوّے اور چڑیاں جو ایسے نڈر ہو چکے تھے کہ منہ سے نوالہ چھیننے کو آتے تھے، مائی سروری کے تنگے کھانے کے قریب تک نہ پھٹکتے تھے ۔ گدڑی کے اُس بے حرکت ڈھیر کے گرد ایک ایسا اَن دیکھا حِصار کھینچا تھا کہ آدمی تو آدمی ، بے سمجھ جانور بھی اُس کے اندر پیر رکھنے کی جرأت نہ کرتا ۔ مائی سروری کو کبھی کسی نے لیٹے ہوئے نہ دیکھا تھا ۔ دن کے چوبیس گھنٹے اور سال کے بارہ مہینے وہ اُسی طور چارپائی پہ ٹانگیں اکٹھی کئے اور بازو اُن کے گرد باندھے ، گھٹنوں پہ کبھی ماتھا ، کبھی ٹھوڑی ٹِکائے بیٹھی کی بیٹھی رہتی تھی ۔ اُس وقت بھی جب تین چار لڑکیاں اُس کی چارپائی اُٹھا کر صُبح و شام ، موسم کے مطابق دھوپ سے چھاؤں اور چھاؤں سے دُھوپ میں مُنتقل کرتیں ، مائی سروری کی بیٹھک میں خلل نہ آتی ۔ ایک بار اسی طرح بیٹھے بیٹھے اُس کے چُوتڑوں میں زخم پڑ گئے ، مگر وہ بیٹھنے سے باز نہ آئی ۔ چنانچہ حکیم کے کہنے پر چارپائی کے اندر قینچی کاٹ کر دو سوراخ نکالے گئے ، اور بان کے کٹے ہوئے سروں کو سُوت سے باندھ کر گانٹھیں لگا دی گئی تھیں ۔ اِس سے چارپائی کے وسط میں دو گول گول آنکھیں نکل آئیں جن کے درمیان زخم آزاد ہوکر خُشک ہو گئے تھے ۔ یہ دو سوراخ بچے کے لئے بھی دو آنکھوں کا کام دینے لگے تھے ۔ ان آنکھوں سے وہ مائی کی تاریک

2009/08/23 13:53

دُنیا میں جھانکنے کے قابل ہو گیا ۔ گرمیوں کی لمبی سہ پہروں کو جب گھر والے سب کڑکتی دھوپ سے جان بچا کر اندھیرے کمروں میں پنکھے جھلتے جھلتے اُونگھ رہے ہوتے تو بچہ کمرے سے دبے پاؤں اُٹھ کر صحن میں نکل آتا ۔ صحن کے دوسرے کونے میں دھریک کی گھنی چھاؤں کے نیچے مائی سروری کی چارپائی پڑی ہوتی ۔ صحن دھوپ میں تپ رہا ہوتا ۔ بچہ جلتے ہوئے پاؤں پہ ٹاپتا ہوا جا کر چارپائی کے پاس کھڑا ہو جاتا ۔ تھوڑی دیر چھاؤں میں تلوے سہلانے کے بعد وہ زمین پر سیدھا لیٹ جاتا ۔ پھر وہ پیٹھ کے بل کھسکتا ہوا چارپائی کے نیچے داخل ہوتا اور ایسے مقام پہ جا پہنچتا جہاں چارپائی کے سوراخ اُس کے چہرے کے عین اُوپر واقع ہوتے ۔ وہاں پہ آرام سے لیٹا ہوا وہ دیر تک اُن سوراخوں کو دیکھا کرتا ۔ وہ سوراخ تو تھے نہیں کہ اُن کے پار کچھ نظر آتا ، بلکہ بان کے بیچ مائی کے کالے تہمد کے دوگول چٹاخ ہی دکھائی دیتے تھے ۔ مگر بچے کے لئے نہ وہ سوراخ تھے نہ کالے کپڑے کے چٹاخ، بلکہ دو روشن آنکھیں تھیں جن کے ذریعے وہ وہاں پہ لیٹا پڑا مائی کی ان دیکھی دُنیا کا تصور کرتا رہتا ۔ اس کے لئے وہ گدڑی کا تاریکی سے بھرا ہوا چھوٹا سا خیمہ نہ تھا بلکہ ایک وسیع و عریض دُنیا تھی جس میں دریا بہتے تھے اور پہاڑ تھے، پہاڑوں پہ درخت اُگے ہوئے تھے جن پہ چمکدار پھل لگے تھے اور نیچے ، درختوں اور دریاؤں کے درمیان، بڑی بڑی روشن سیاہ آنکھوں والے ہرن پھلانگتے پھرتے تھے اور کبھی خراماں ٹہلتے تھے ۔ بچہ اپنے تصور میں ان سب جگہوں اور پھلوں اور پھولوں اور جانوروں سے جان پہچان رکھتا تھا اور جہاں چاہتا آزادی اور حیرت کے عالم میں گھومتا پھرتا تھا ۔ حتیٰ کہ ایک روز اُس کا یہ خواب بھی تمام ہوا ۔

وہ دن مائی سروری کا ماہوار نہلائے جانے کا دن تھا ۔ مہینے کے اس ایک دن عموماً یُوں ہوتا کہ پہر آدھ پہر کے لئے گھر میں مرد ذات کا داخلہ بند کر جاتا تھا، یہاں تک کہ بچے کو بھی باہر کھیلنے کی ہدایت کر کے دروازہ بند کر دیا جاتا ۔ پھر دو لڑکیوں کی مدد سے مائی کی چارپائی اُٹھوا کر نلکے کے پاس لے جائی جاتی ۔ مائی کے کپڑے الگ کئے جاتے اور اُسے دیسی صابن سے مَل مَل کر نہلایا جاتا ۔ نہلانے کے بعد اُس کا بدن موٹے کھیس کی مدد سے خشک کیا جاتا، صاف چادر اور صاف کُرتا پہنایا جاتا ، بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی ہوتی ، اور اس کے بعد

2009/08/23 13:54

مائی کو گدڑی اُڑھا کر اپنی جگہ پہ بٹھا دیا جاتا ۔ یُوں مائی کا خیمہ مزید ایک ماہ کے لئے دوبارہ کھڑا ہوتا تھا اور بچے کی آنکھوں سے پوشیدہ ہی پوشیدہ یہ سب کام انجام پا جاتا ۔ اُس روز جب بچے کی یہ دُنیا مسمار ہوئی وہ بد قسمتی سے باہر کھیلنے کی بجائے، اپنے ساتھ والے گھر کی چھت سے ہوتا ہوا اپنے کوٹھے پر جا چڑھا ۔ کوٹھے کی دیوار کے جھرنوں سے آنکھ لگا کر جو نیچے صحن میں اُس نے جھانکا تو ایک ایسا منظر دکھائی دیا کہ بچہ گویا مسحور ہو کر دیکھتا ہی رہ گیا ۔ اُس نے دیکھا کہ ایک عورت تنگے بدن چارپائی کی پائتیوں پہ سر نیہوڑائے بیٹھی ہے اور اماں اُسے صابن مل رہی ہے، جبکہ دو لڑکیاں پانی کا ڈول تھامے پاس کھڑی ہیں ۔ وہ بدن کیا تھا کہ ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں، جیسے ٹوٹی ہوئی لکڑی کی چھٹیاں ایک دوسری کے سہارے کھڑی ہوں ، جن کی نوکیں کھال کے اندر سے اِدھر اور اُدھر سے جھانک رہی تھیں، اور لگتا تھا کہ ہاتھ لگنے سے گر کر ڈھیر ہو جائیں گی ۔ اُن کے اُوپر اُوپر ڈھیلی سی کھال گیلی چادر کی مانند لٹک رہی تھی اور اماں کے صابن ملتے ہوئے ہاتھوں کے اندر چھاتیوں کی سُکڑی ہوئی خالی تھیلیاں تھلپ تھلپ کر رہی تھیں ۔ جھرنے سے آنکھ لگائے بچہ ایک ایسے سحر کے اندر مبتلا ہو گیا جیسے سُنا ہے کہ آدمی سانپ کی آنکھ سے آنکھ مل جانے پہ گرفتار ہو جاتا ہے کہ جس کے زیرِ اثر جائے رفتن نہ پائے ماندن کی کیفیت اُس پہ طاری ہو جاتی ہے ۔ وہ اُس وقت تک بے حرکت وہاں پہ بیٹھا رہا جبتک کہ گدڑی کا خیمہ چارپائی پہ دوبارہ استوار نہ ہو گیا ۔ مگر اس وقت تک بچے کی وہ اپنی الگ اور اکلوتی دُنیا اُس کے وجود سے کھسکنا شروع ہو چکی تھی ۔ وہ وہیں پر سیدھا زمین پہ لیٹ گیا اور آسمان پر نظر جما کر دیکھنے لگا ۔ وہ موسمِ بہار کا ایک ایسا دن تھا جب آسمان سفیدی مائل ہونے کی بجائے گہرے نیلے رنگ کا ہوتا ہے اور نیلاہٹ اُس میں ایک وسیع و عمیق گہرائی پیدا کر دیتی ہے ۔ اِس وُسعت کے زیرِ لیٹے لیٹے دیر تک آسمان کو دیکھتے رہنے پر بچے کو وہ نیلی سطح پہلے بُہت اُونچی اور پھر اپنے بُہت قریب سرکتی ہوئی محسُوس ہوئی ، اور اُس کو لگا کہ جیسے آسمان ایک ڈھکنے کی مانند زمین کے پیندے کو اپنے نیچے ڈھک کر رکھے ہوئے ہے ، اور اُوپر سے دباتا چلا آ رہا ہے ۔ اُسے اپنا وجود سُکڑتا ہوا محسوس ہوا، حتّٰی کہ اُس نے اپنے ہاتھ اور پاؤں اور بدن کے دوسرے کنارے اپنے اصلی ماپ کو پہنچے ہوئے دیکھے ۔ قدو قامت کی وہ بڑائی جو اُس نے چارپائی کی [illegible] آنکھ [illegible] میں کر لی تھی، اب اُس کی زد

2009/08/23 13:56

سے باہر ہوتی جارہی تھی ۔ وہ دُنیا جہاں وہ کسی دیوہیکل کی طاقتوری اور ایک پرندے کی سی ہلکاہٹ سے سفر کیا کرتا تھا، اُس دُنیا کی بصیرت اُن آنکھوں سے ضائع ہوگئی تھی ۔ مائی سروری کے بارے میں سُنی سُنائی تھی کہ ایک زمانے میں وہ اِس علاقے کی حسین عورتوں میں سے تھی، جس کے گُن آج بھی پُرانے لوگوں کے درمیان گائے جاتے تھے ۔ پھر بد قسمتی سے نوجوانی میں ہی اُسے ایک زمیندار کے لڑکے سے عشق ہوگیا ، اور اُسی عشق کی سوگواری میں وہ رُل گئی تھی ۔ بچے نے بھی یہ اُڑتی اُڑتی سُن رکھی تھی، اور گو اس کے اصل معنی کی سمجھ بوجھ اِس عُمر میں اُس کو نہیں تھی، مگر اِس افواہ میں جِنّوں اور پریوں کی کہانیوں کا سا ایک رنگ تھا ۔ وہیں لیٹے لیٹے بچے نے اُس بات کو بھی یاد کرنے کی کوشش کی، مگر بیسُود ۔ وہ کہانی جس نے ایک عرصے تک بچے کے ذہن میں جادو جگائے رکھا تھا، اب اُس کے دِل میں ذرا سی حرکت پیدا کرنے سے قاصر رہی ۔ اُس روز وہ سورج غروب ہونے تک وہیں زمین پہ لیٹا آسمان کو دیکھتا رہا، حتّٰی کہ گھر میں اُس کی تلاش شروع ہوگئی ۔ کچھ دیر کے بعد جب باہر چیخ و پُکار مچی تو وہ اپنا دُکھتا ہوا بدن لے کر اُٹھا اور آہستہ آہستہ کوٹھے سے اُتر آیا ۔ اُس روز کے بعد بچہ کبھی نہ بھڑکتی ہوئی دوپہروں کو باہر نکلا نہ مائی سروری کی چارپائی تلے کھسک کر لیٹا ۔ بہار کا وہ شاندار دِن اُس کا جادُو چھین کر لے جا چُکا تھا ۔

نیند ہی نیند میں کہیں بچہ اُٹھ بیٹھا تھا ۔ جب اُس کی آنکھ کُھلی تو وہ بستر پہ چوکڑی جمائے بیٹھا تھا ۔ ہوش کے پہلے چند لمحوں میں اُسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں پہ تھا اور کیا کر رہا تھا ۔ آہستہ آہستہ جب اُس کے حواس برابر ہوئے تو اُس نے حیرانگی سے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ اُس کی امّاں کا پلنگ معمول کے مطابق اُس کے پلنگ سے لگ کر بچھا تھا ۔ مگر اُس کی مچھر دانی کی جالی کا ایک کونا اُٹھا ہوا تھا ۔ یہ وہ سوراخ تھا جہاں سے اُس کی امّاں ہاتھ اندر داخل کرکے اُسے پنکھا جھلا کرتی تھیں ۔ عموماً وہ اُس وقت تک پنکھا جھلتی رہتیں جب تک کہ وہ سو نہ جاتا ۔ پھر وہ اپنا ہاتھ کھینچ کر مچھر دانی کا پلّو برابر کر دیا کرتیں ۔ مگر آج معلوم ہوتا تھا کہ نیند نے اُن پہ غلبہ حاصل کر لیا تھا ۔ اُن کا بازو دونوں پلنگوں کے درمیان تنگا پڑا تھا اور پنکھا ہاتھ سے سرک کر زمین پر گر چُکا تھا ۔ بچہ دیر تک بے خیالی سے اُس سوراخ کو دیکھتا رہا جسے اُس کی امّاں برابر کرنا بھول گئی

2009/08/23 14:02

تھیں ۔ اُس سوراخ سے دو تین مچھر اندر داخل ہو کر اُس کے کانوں میں بھنبھنا رہے تھے ۔ اِن مچھروں نے اُسے اُٹھا کر بٹھا دیا تھا ۔

بچے نے سر اُٹھا کر آسمان کو دیکھا ۔ آسمان کے ایک جانب آدھا چاند رُکا کھڑا تھا ۔ بچے نے یاد کیا کہ چند روز پہلے سونے کے وقت بستر میں لیٹے لیٹے اُس نے چاند کو دیکھا تھا ۔ اُس وقت چاند پُورا گول تھا اور سر کے عین اُوپر آسمان کے بیچ میں ٹنگ رہا تھا ۔ اُس رات کو چاندنی اِتنی سفید تھی کہ دِن کا سماں پیدا کرتی تھی اور آنکھیں بند کر لینے پر بھی روشنی پپوٹوں سے چھن چھن کر آتی رہتی تھی ۔ اُس رات کے بعد چاند نے ٹوٹنا شروع کر دیا تھا ۔ اب بچے کو چاند ایک ایسی روٹی کی مانند معلوم ہوتا تھا جس کے کنارے جھڑتے جا رہے ہوں ۔ اُس نے ایک سُست نظر صحن میں چاروں طرف دوڑائی ۔ چاندنی کوٹھے کی دیواروں سے گُزر کر مُشکل سے آدھے صحن تک پہنچ رہی تھی اور اس میں تاریکی آ چکی تھی ۔ پُورے چاند کی روشنی صاف سُتھری رات میں ایک اسرار کی کیفیت پیدا کرتی تھی ، جبکہ یہ تاریک چاندنی اپنے اندر ایک راز لئے ہوئے معلوم ہو رہی تھی ، گویا کسی غلاف میں چُھپی ہوئی ہو ۔ بچے کی نیند اُڑ چکی تھی ۔ اُس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اِس چاندنی کے غِلاف کو پھاڑ کر ننگا کر دے ، تاکہ شفاف روشنی اپنا اسرار لئے دوبارہ سارے صحن میں پھیل جائے ۔ چاندنی کے اِس راز تک پہنچنے کی جُستجو نے بچے کے بدن میں حرکت پیدا کر دی ۔ وہ مچھر دانی میں ماں کے بازو والا سوراخ بند کرنے کی بجائے دوسری جانب سے پلو اُٹھا کر باہر نکل آیا ۔ اُس نے ہَولے سے پاؤں اپنی کھیڑی میں داخل کئے اور صحن کے بیچ کھڑا ہو گیا اب نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی ۔ اُس کی نظر لڑکیوں کی چارپائیوں کی جانب مُڑی اور وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پہلی چارپائی کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ تازی نیند میں بیہوش پڑی تھی ۔ بچے کی نظر تازی کے پیٹ پہ جا اٹکی ۔ سوتے میں اُس کا کُرتہ اُوپر تک سرک گیا تھا اور چاند کی آدھی روشنی میں اُس کا پیٹ سانس کے ساتھ ہَولے ہَولے تھرا رہا تھا ۔ درمیان میں ناف کے اندر ہلکی سی تاریکی کا سایہ تھا جس کے اندر جِلد کی ایک شِکن نظر آ رہی تھی ۔ بچے کا جی بے اختیار چاہنے لگا کہ وہ اپنی ننھی ناف میں داخل کر کے گول گول گھمائے ۔ اُس نے تازی کی ناف پہلے کبھی دیکھی

2009/08/23 14:02

تھی کو تازی نے اُسے کئی بار نلکے کے پیچھے مَل مَل کر نہلایا تھا اور نہلاتے وقت وہ کبھی اپنی اُنگلی اُس کی ناف میں ڈال کر کھجلی کیا کرتی تھی ۔ بچے نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ تازی نے نیند میں کروٹ بدل ڈالی اور ساتھ ہی ہاتھ سے اپنے پیٹ کو کھجلانے لگی ۔ جب وہ کھجلا چکی تو ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر دوبارہ خواب میں چلی گئی ۔ مگر کھجلانے کی حرکت سے تازی کا کُرتہ کچھ اور اُوپر اُٹھ گیا جس سے اُس کی ایک چھاتی آدھی سے زاید عُریاں ہوگئی ۔ اُسے دیکھتے دیکھتے بچہ ایک سحر کی حالت میں ہَولے سے اپنے پاؤں پہ بیٹھ گیا ۔ اُس نے ہلکے سے اپنا ہاتھ چارپائی کی چوکاٹھ پہ رکھا ، اُس پہ اپنی ٹھوڑی ٹکائی ، اور چھاتی کی آنکھ سے آنکھ مِلا کر دیکھنے لگا ، حتّٰی کہ منظر کی گردش ایسی پھری کہ اندھیرا چاروں طرف سے اُمڈ اُمڈ کر اُس کی آنکھوں میں اُترنے لگا ۔ اُس نے سر اُٹھا کر آنکھیں جھپکیں ، اِدھر اُدھر دیکھا، سر کو آہستہ سے جھٹک کر منظر کو صاف کیا ، پھر از سرِ نَو آنکھیں چھاتی پہ جما دیں ۔ اُس نے چھاتیاں اماں کی پہلے دیکھی تھیں ، اور مائی سروری کی، اور دو ایک اور تگڑے بدن عورتوں کی اتّفاقیہ دیکھنے میں آگئی تھیں ۔ مگر ایسی چھوٹی سی کَس کر اُبھری ہوئی گول گندمی رنگ کی اور مہین سے اٹھے ہوئے نوکدار مُنہ والی چھاتی پہلے اُس کے دیکھنے میں نہ آئی تھی ۔ ایک ایک کرکے روئیں اُس کے بدن پر کھڑے ہونے لگے ۔ اِس گرم رات میں بھی اُس کی جِلد روئیں کی جڑوں پر تھی تھی بٹنیوں کی شکل میں ابھر آئی جیسی ٹھنڈک لگنے پر ہو جاتی ہے ۔ اُس کا دھیان ناف سے ہٹ کر اب چھاتی پہ مرکوز تھا اور اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اپنی اُنگلی اُس گدرے گوشت میں چبھو دے ۔ اُسی وقت تازی کے جِسم میں پھر حرکت ہوئی اور وہ کروٹ سے ہٹ کر سیدھی پُشت پر دراز ہوگئی ۔ ساتھ ہی اُس نے نیند میں ایک پَل کو آنکھیں کھولیں اور ہاتھ سے کُرتہ ناف پر برابر کر دیا ۔ وہ منظر اب بچے کی آنکھوں سے اوجھل ہو چُکا تھا ، گویا کوئی راز پَل کے پَل کو منکشف ہو کر دوبارہ پردے میں چلا گیا ہو ۔ مگر وہ راز اُس بدن میں قوت کی ایک لہر چھوڑ گیا تھا ۔ جب وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا تو جِسم کا بار اپنے پاؤں پہ محسوس تک نہ ہوا ، جیسے وہ ہوا کے ایک جھونکے میں تبدیل ہوگیا ہو ۔ اُس کی نظر اب تازی کی ٹانگ پہ جا رُکی تھی جِس پہ شلوار آدھی ران تک چڑھی ہوئی تھی ۔ ٹانگ پتلی اور گول تھی اور رنگ بھی ہاتھ پاؤں کی نِسبت ہلکا سا تھا جیسا کہ اُس کے پیٹ اور چھاتی کا رنگ تھا ۔ وہ لمبی ٹانگ تازہ اور تنے ہوئے

2009/08/23 14:03

گوشت میں گندھی تھی ۔ اُسے دیکھتے دیکھتے بچے کے بدن میں بھی ایک عجیب سناٹو اُٹھا اور اُس نے بے خیالی سے اپنی اُنگلی آہستہ سے پاؤں کے اُٹھے ہوئے انگوٹھے پر رکھ دی ۔ تازی کو نیند میں اِس کا احساس تک نہ ہوا ۔ بچے نے محسوس کیا کہ گو اُس کی اُنگلی کا لمس انگوٹھے پہ بے معلوم تھا مگر کسی طور سے تازی کے جسم کی حرارت سمٹ کر اُس کے انگوٹھے میں آجمع ہوئی تھی اور وہاں سے شرائے بھرتی اُس کی اُنگلی کے راستے اُس کے اپنے بدن میں بہتی چلی آرہی تھی ۔ جب تازی نے اپنی ٹانگ ذرا سی ہلائی تو بچے نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔ مگر اس دوران میں اُس کے بدن کو گویا پر لگ چکے تھے ۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی ہلکے پھلکے پرندے کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے اور اُڑان کے لئے بیتاب ہے ۔ اُس کا ذہن پھیل کر ایک وسیع و عریض آسمان بن گیا تھا اور اُس کے دِل میں اُڑان کے سوا کسی بات کا دھیان نہ تھا ۔ اُس نے مڑ کر اپنے بستر پر نظر تک نہ ڈالی ۔ پنجوں کے بل ہلکے ہلکے قدموں چلتا ہوا وہ باہر کی جانب روانہ ہوا ۔ گھر کا کُتا جو اُسے بستر سے اُترتے دیکھ کر کان اُٹھائے اُس کے پاس چلا آیا تھا، اور پھر جب وہ تازی کی چارپائی کے کنارے بیٹھ گیا تھا تو کُتا بھی اُس کے پاس زمین پر لیٹ گیا تھا ، اب اُٹھ کر بچے کے پیچھے ہو لیا ۔ جب بچے نے دروازہ کھول کر گھر کے باہر قدم رکھا تو اُس کی بوٹی بوٹی اُڑ رہی تھی ۔

دوسری دُنیا کا ایک منظر :۔

اپنی گلی اور ایک مُختصر سا میدان پار کر کے بچہ مُجرے کی جانب چل پڑا ۔ گو نام سے یہ مُجرہ کہلاتا تھا مگر حقیقت میں ایک لمبا چوڑا احاطہ تھا جِس کے اندر کئی چھوٹی بڑی کچی اور پکی عمارتیں کھڑی تھیں ۔ پکی عمارتوں میں دو بڑے بڑے کمرے تھے جِن میں کھڑکیاں اور روشندان بنے تھے ۔ ایک میں مسجد قائم تھی جہاں با جماعت نماز ادا کی جاتی تھی ۔ دوسرا کمرہ درویشوں کے اُٹھنے بیٹھنے، درس دینے، درس حاصل کرنے، وظیفہ اور حِفظ اور قرآن خوانی، اور سال کے سال قوالیاں مُنعقد کرنے میں کام آتا تھا ۔ کچی عمارتوں میں ایک وسیع ہال تھا جو لنگر خانہ کہلاتا تھا ۔ اِس دالان میں مُختلف جِنسوں کی بوریوں کا ذخیرہ تھا ۔ ایک طرف پیاز اور لہسن گرمی سے بچاؤ کی خاطر فرش پہ پھیلے تھے، اور دالان میں اینٹوں کے دو بڑے بڑے چُولہے تھے جِن پہ سردیوں کے موسم میں دیگیں پکتی

2009/08/23 14:03

تھیں ۔ دالان کے ساتھ متعدد کچی کوٹھڑیوں کی قطار تھی جن میں اکثر کے اندر درویشوں کی رہائش تھی ، باقی غسل اور رفع حاجت کی جگہیں تھیں ۔ سارے احاطے کے گرداگرد نیچی سی پتھروں کی بنی ہوئی دیوار کھچی تھی جو اسے گاؤں سے الگ ایک چھوٹی سی بستی کی شکل عطا کرتی تھی ۔ یہ دو فُٹ اُونچی دیوار ٹیڑھے میڑھے مُختلف سائز کے پتھروں سے تعمیر شدہ تھی ، مگر پتھر اِس مہارت سے ایک دوسرے کے اُوپر جمائے گئے تھے گویا خاص طور پہ گھڑ کر شکل کے ساتھ شکل ملائی گئی ہو ۔ ساری دیوار کے اندر ایک سوراخ تک دکھائی نہ دیتا تھا اور اینٹ گارا لگی فصیل کی مانند مضبوطی سے کھڑی تھی ۔ دیوار کے بیچ ایک مقام پہ، جو احاطے کا ماتھا کہا جا سکتا تھا، دس بارہ فُٹ چوڑائی کا گیٹ کھڑا تھا ۔ یہ گیٹ تین نو عُمر درختوں کے پتلے پتلے تنوں کی مدد سے بنایا گیا تھا ، اسطرح کہ دو تنے سیدھے زمین میں گڑے تھے اور تیسرا اُوپر اُن کے سروں پہ کیلوں سے آر پار ٹھونک دیا گیا تھا ۔ اِس اُوپر والے تنے کے ساتھ ٹین کا ایک چوڑا سا بورڈ لٹکا ہوا تھا ۔ بورڈ کی زمین سُرخ رنگ کی تھی اور اُوپر سبز حروف میں یہ عبارت لکھی تھی، 'حُجرۂ پاک حضرت پیر کرامت علی شاہ بُراقی عُرف بابا چدر پوش بائی گدی شریف کچا کھوہ ، سلسلۂ کرامتیہ ، موضع کچا کھوہ، پنجاب'۔ یہ شاہ صاحب بچے کے والد محترم تھے ۔ بچے کا نام سلامت علی تھا ۔

گیٹ کے رستے داخل ہونے کی بجائے بچہ دو فُٹ اُونچی دیوار پر لپک کر چڑھ گیا ۔ وہاں سے ٹاپ کر جب بچے نے احاطے کے اندر قدم دھرا تو سیدھا ہوا کُتا وہیں پہ رُک گیا ۔ اُس مُقدس رقبے پہ کُتے کے ناپاک قدم کا داخلہ ممنوع تھا ۔ کچھ دیر تک کُتا بُھوکی بُھوکی مسکین نظروں سے بچے کے سائے کو عمارتوں کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر ٹانگیں سمیٹ کر قناعت سے پیٹ کے بل بیٹھ گیا اور تھوتھنی زمین پر رکھ کر ستانے لگا ۔

احاطے کے اندر کُھلی زمین پر کچی کوٹھڑیوں کے مقابل آٹھ دس چارپائیاں بچھی تھیں ۔ ان چارپائیوں پہ درویش اور اِمام ، کچھ تنکے ، کچھ چادریں اوڑھے سو رہے تھے ۔ صِرف ایک طرف کو دِیوار کے ساتھ لگ کر سائیں ناتکا زمین پر لمبا پڑا تھا ۔ بارہ مہینے سائیں ناتکے کی کمر کے گِرد ایک مُختصر سی دھوتی بندھی رہتی اور اس کے سوا اُس کے بدن پہ کچھ نہ ہوتا تھا ۔ صِرف سردیوں کے موسم میں

2009/08/23 14:04

وہ اپنے گرد ایک کھیس لپیٹ لیتا تھا ۔ مگر وہ کبھی کوٹھڑی یا کسی کمرے میں نہ جاتا تھا ۔ سردی ہو یا گرمی ، کھلے آسمان کے نیچے دن رات رہتا ، اور کھاٹ کے نزدیک تک نہ پھٹکتا بلکہ زمین پر بیٹھتا اور وہیں پہ سوتا تھا ۔ صرف ایک عادت اُس کی تھی کہ ہمیشہ احاطے کی پست سی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھتا اور اُسی کے سائے میں سوتا تھا ۔ مذہب کے ظاہری اطوار سے اُس کو کوئی لگاوٹ نہ تھی ۔ نہ اُس نے کبھی درس میں حصہ لیا نہ ہی نماز کی نیت کی تھی، طہارت کے آداب سے کوئی واسطہ نہ رکھتا تھا ۔ نہانے دھونے کے پاس تک نہ پھٹکتا، جس کے نتیجے میں اُس کے سر اور ڈاڑھی کے بال گرد اور غلاظت کے باعث موٹی موٹی لٹوں کی صورت میں چپک کر لٹکے رہتے تھے ۔ ہر ایک کے ساتھ وہ نہایت دُرشتی اور بد زبانی سے پیش آتا تھا ۔ اُس کی آنکھیں مُستقِل سُرخ رہتیں اور چہرے پر غیض و غضب کے آثار رہتے تھے ۔ سب انسان و حیوان کو وہ گالیوں سے مخاطب کرتا تھا ۔ اگر کوئی پاس نہ ہو تو بے وجہ مُنہ اُٹھا کر گالیاں بکتا رہتا، یہاں تک کہ پیر کرامت علی شاہ صاحب، جو ذاتی طور پہ نہایت دِھیمی طبعیت والے اور نیک خصلت انسان اور روحانی طور پہ خُدا کی محبت میں گم تھے، جن سے کہ ایک زمانہ عقیدت رکھتا تھا، ان سے بھی بے ادبی اور بد لحاظی کا سلوک روا رکھتا تھا ۔ سائیں ننگا دُنیا بھر میں وہ واحد آدمی تھا جو پیر صاحب کے ساتھ تُو تڑاک سے پیش آتا تھا اور کئی بار اُن کی رُوبیشی میں واہی تباہی بکنا شروع کر دیتا تھا ۔ مگر پیر صاحب ہمیشہ اُس کے ساتھ نرمی برتتے تھے ۔ یُوں تو سائیں ننگے کی ہر بات لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھی ، مگر پیر صاحب کی موجودگی میں چند باتیں ایسی تھیں جنہیں وہ بار بار دہرانے لگ جاتا تھا ۔ مثلاً اُنہیں دیکھتے ہی وہ 'قیدی، قیدی ، قیدی' کی گردان کرنے لگتا، یا پھر اُونچی آواز میں 'مُردار کا ڈیرہ پیٹ میں ، مُردود کا ڈیرہ قید میں' پُکارنے لگتا ۔ اِس کے باوجود پیر صاحب کے وطیرے میں کبھی فرق نہ آیا تھا ۔ صرف کبھی کبھار سائیں کی پُکار سُن کر اُن کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہو جاتے تھے ۔ اکثر اوقات وہ صرف مُسکرا کر گزر جاتے ، یا زیادہ سے زیادہ کسی پاس کھڑے ہوئے معتقد سے کہتے 'سائیں اللہ کا پیارا ہے، کچھ نہ کہو' ۔ یہ بات کسی سے چُھپی ہوئی نہ تھی کہ پیر صاحب کے دِل میں سائیں ننگے کیلئے خاص جگہ تھی ۔ سائیں کی کالیوں کی بہار اُس دیکھنے

2009/08/23 14:04

کی ہوتی جب چار چھ مہینے میں ایک ایک بار پیر صاحب کے حکم پر نائی، سائیں کے ناخن کاٹنے کے لئے آتا ۔ یُوں تو سائیں پر ہاتھ ڈالنے کی کسی میں ہمت نہ تھی، مگر جب پیر صاحب اپنی موجودگی میں نائی کو حکم دیتے تو سائیں اپنا ہاتھ نائی کے ہاتھ میں دے دیتا، گو اُس کی آنکھیں غصّے سے اُبلی پڑتیں اور زبان سے گالیوں کی بوچھاڑ جاری رہتی ۔ نائی اُس کے ہاتھ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہے جاتا، 'سائیں کیوں میرے اگلے پچھلوں کی مٹی خراب کرتا ہے ، بیچارے مر مرا گئے، تیرا کیا نقصان کر گئے ۔ میں تو تیری صفائی ہی کر رہا ہوں ، کیا بُرا کر رہا ہُوں' ۔ جیسے ہی نائی اُس کی آخری اُنگلی کا ناخن کاٹ چکتا سائیں اچانک ایک زور دار دوہتڑ نائی کی پیٹھ پر جماتا اور کود کر اُٹھ کھڑا ہوتا ۔ پھر وہ دیوار کے پاس جاکر زمین پر بیٹھ جاتا اور دُور سے پیر صاحب کی جانب رُخ کرکے 'قیدی ، قیدی، قیدی' اور 'مُردار کا ڈیرہ پیٹ میں' کی رٹ لگا دیتا ۔ کچھ دیر کے بعد وہ مُنہ پھیر کر ہوا میں گالیاں بکنے لگتا ۔

سائیں کے بارے میں البتہ ایک بات مشہور تھی ۔ جہاں وہ مرد، عورت، حیوان و نباتات تک کو بخشتا نہیں تھا، اُس نے آج تک کسی بچے کے ساتھ برہمی نہ دکھائی تھی ۔ کوئی بھی بچہ اُس کے رُو برو آجائے ، سائیں کی زبان میں گنگ پڑجاتا تھا ۔ یہ نہیں کہ اُس کے اندر نرمی یا محبت آجاتی، بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُس نے آسیب دیکھ لیا ہو ۔ آواز اُس کی زبان کو چھوڑ جاتی اور وہ گم سُم ہو جاتا اور اُس وقت تک اِس حالت میں رہتا جب تک کہ بچہ اُس کے سامنے سے ہٹ نہ جاتا ۔ اِسی وجہ سے گاؤں کے بچے سائیں سے ذرہ برابر خوف نہ کھاتے تھے ۔

سلامت علی درویشوں کی چارپائیوں کے برابر سے گُزرتا ہوا سائیں کے سر پہ جا کھڑا ہوا ۔ سائیں ایسے آرام سے سخت زمین پہ سویا پڑا تھا گویا بِستر پہ دراز ہو ۔ بچہ کچھ دیر تک وہیں کھڑا سائیں کو آسانی سے محوِ خواب لمبے سانس لیتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ پھر اُس کے جی میں کیا آئی کہ پلٹ کر حُجرے کی جانب چل پڑا ۔ گو یہ سارا احاطہ اور اِس کی عمارتیں حُجرہ کہلاتی تھیں، مگر دراصل حجرہ اس سارے سلسلے میں ایک ہی تھا اور اسی کے وجود سے اِس چھوٹی سی جگہ کا نام چلتا تھا ۔ یہ حُجرہ وہ کمرہ تھا جو بچے کے والد بزرگوار پیر صاحب گدّی والے کی ذاتی

2009/08/23 14:04

استعمال میں تھا ۔ یہ کمرہ کی عمارتوں کے ساتھ آخر میں واقع تھا، اور باہر سے اِس کی امتیازی حیثیت اُس تکونے سبز جھنڈے سے واضع ہوتی تھی جو ایک بانس کے سرے پر بندھا حُجرے کی چھت کے اُوپر ہر وقت پھڑ پھڑایا کرتا تھا ۔ جھنڈے پر بڑے سُنہری حرُوف میں لکھا تھا، گدّی شریف کرامتی، اور حاشیے پر چھوٹے سُنہری الفاظ میں بِسم اللہ الرّحمانِ الرّحیم اور کلمہ شریف درج تھا ۔ حُجرے کے دروازے پر ٹھکے ہوئے کیلوں سے مختلف نوعیت کی اشیاء، جیسے تازہ اور باسی پھولوں کے ہار، گانٹھیں لگے ہوئے سُوت کے دھاگے ، کچھ تعویز اور تسبیحیں وغیرہ، لٹکی رہتی تھیں ۔ اندر حُجرہ دو کمروں میں بٹا تھا ۔ ایک باہر کی بیٹھک جہاں حاضری کے لئے آنے والے معتقدین یا غرضمند اپنی باری کے انتظار میں پھولدار چادر بچھی زمین پر اکر بیٹھا کرتے ۔ دوسرا اندر والا کمرہ ، جہاں پیر صاحب کی اصل گدّی کا تکیہ تھا ۔ اس کمرے میں قالینوں کا فرش پڑا تھا اور دیوار کے ساتھ ساتھ گدیاں اور تکیے رکھے تھے ۔ جِس جگہ پر پیر صاحب کی نشست تھی وہاں سب سے اعلےٰ درجے کا چھوٹا سا قالین بچھا تھا اور اوپر سبز مخمل کا گاؤ تکیہ دیوار کے ساتھ پڑا تھا ۔ دائیں طرف کو سبز مخمل کی ہی جائے نماز بچھی تھی جِس پہ پیر صاحب کبھی کبھار استغراق کی حالت میں جا بیٹھے تھے گو اُنہیں نماز ادا کرتے ہوئے کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا ۔ جائے نماز کا ایک کونہ ہر وقت اُلٹا رہتا تھا تاکہ خالی وقت میں اُس کے اُوپر شیطان سے کِسی خباثت کے سرزد ہونے کا امکان نہ رہے ۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تصویریں ، اور ہاتھ سے لکھی ہوئی قرآنی آیات ، شیشے کے اندر فریم شدہ چوکھٹوں میں دیواروں پر چاروں طرف ٹنگی ہوئی تھیں ۔ دِن رات کے اکثر اوقات اگر بتیوں کا خوشبُودار مدّہم دُھواں حُجرے کے ماحول میں تحلیل ہوتا رہتا تھا ۔ بچے نے جب دروازے میں قدم رکھا تو باہر والی بیٹھک خالی تھی ۔ پیر صاحب کے حکم کے مطابق اُس احاطے کے اندر کی عمارت ایسی نہ تھی جِس کا دروازہ چوبیس گھنٹے کُھلا نہ رہتا ہو ۔ اس حکم سے اِ صرف ایک دروازے کو تھا ، اور وہ دروازہ اصل حُجرے کا تھا ۔ یہ دروازہ اُس وقت کُھلتا تھا جب پیر صاحب کا قیام حُجرے سے باہر کسی اور مقام پہ ہ ۔ جوں ہی وہ حُجرے میں وارد ہوتے ، دروازہ بند ہو جاتا اور اُس وقت تک بند رہتا جب تک وہ اندر قیام پذیر رہتے ، گویا دروازے کا بند ہونا ہی اندر پیر صاحب کی موجودگی کی دلیل تھا ۔ بچے نے بند دروازے کی درزوں میں سے لیمپ کی روشنی

2009/08/23 14:05

چمنتی ہوئی دیکھی اور کچھ دیر تک ہلکے ہلکے سانس لیتا ہوا خاموش کھڑا رہا ۔ پیر کرامت علی ، جنہیں خلقت خدا بابا پیرو مُرشد کے نام سے بھی یاد کرتی تھی، اپنی بیوی اور بچے کی زبان سے فقط شاہ جی کہلاتے تھے ۔ بچہ جو یوں بھی کبھی کبھار ہی حُجرے میں قدم رکھتا تھا، رات کے اِس پہر تو کبھی گھر سے نہ نِکلا تھا ۔ اسی ہچکچاہٹ میں وہ بند دروازے کے باہر ٹھہرا رہا کہ شائد شاہ جی سو رہے ہوں ۔ کرامت علی شاہ کے بارے میں ایک غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ کبھی اپنے گھر کے اندر نہیں سوتے تھے ۔ کبھی بُھولے بھٹکے آنکلتے تو بچے کی ماں کے کمرے میں بیٹھ کر اُس سے ایک آدھ گھڑی کوئی بات کر لیتے ، ورنہ ہمیشہ حُجرے میں رات بسر کرتے ، سوائے سال کے ایک دو موقعوں کے جب وہ دورے پر آس پاس کے گاؤں میں اپنے چند ایک بڑے بڑے مُریدوں کے ہاں قیام کی غرض سے نکلتے ۔ اِس دورے کا مقصد مُریدوں کو زیارت سے نوازنا تو تھا ہی ، اِس کے علاوہ نئے معتقدین کو وعظ و نصائح اور بیعت کا موقعہ فراہم کرنا بھی ہوتا تھا ۔ دورے کے اِختتام پہ پیسے کے علاوہ بُہت سا چڑھاوے کا مال بھی آتا جس کو لنگر خانے میں داخل کر دیا جاتا ۔

بچے نے آخر جُرأت کر کے دروازے کے پٹ پہ ہاتھ دھرا ۔ اندر سے کُنڈی نہ لگی تھی ۔ پٹ بے آواز طور پہ وا ہوگیا ۔ بتی اِتنی دھیمی تھی کہ اگلی کے ناخن کے برابر ہی لائٹ دے رہی تھی ۔ مگر بچے کی نظریں چند ہی لمحے کے وقفے میں اُس نیم روشن کمرے سے مانوس ہوگئیں ۔ اُس کے بعد اُس نے جو منظر دیکھا اُس نے بچے کو از سرِ نو گویا مسحُور کر لیا ۔ مگر یہ سحر ایک انوکھی طرز کا تھا ۔

شاہ جی اپنی گدی پہ تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے ۔ اُن کے ایک ننگا بدن قالین پر لمبا چت پڑا تھا ۔ اِس بدن کے پاؤں دروازے کی اور سر دوسری جانب تھا ۔

نو عُمری کے اعتماد کی کو حد مقرر نہیں ہوتی، پھر بھی بچے نے از حیرت کے ساتھ آنکھیں کھول کھول کر اِس منظر کو دیکھا اور اسے پہچاننے کی کوشش کی ۔ اُسے نظر آیا کہ وہ الف ننگا بدن، جِس کے تلوں پہ جُوتا تک نہ تھا ، ایک عورت کا جِسم تھا جس پہ سر سے لے کر پاؤں تک شاہ جی اپنا ایک ہاتھ نہایت آہستگی

2009/08/23 14:05

سے بار بار پھیرے جا رہے تھے ۔ عورت کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے حرکت وہاں لیٹی تھی ، گویا بیہوش پڑی ہو ۔ مگر شاہ جی کے ہاتھ میں خدا جانے کوئی تیل لگا تھا یا کیا تھا، کہ اُس جسم کے اعضاء چمکدار چکنی مٹی کے ایسے ڈلوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے جو ہل کا تیشہ لگ لگ کے کٹ چکے ہوں اور گول اور نوکدار اور ہموار شکلوں میں شاہ جی کے ہاتھ سے اُبل اُبل کر نکلے پڑتے تھے ۔ بچے کی نظر اب آسانی سے کمرے کے آرپار اُتر رہی تھی اور خواہ گوشت کے چکے تھے خواہ بالوں کے گچھے، اُس کی آنکھ کی حد سے باہر نہ تھے ۔ شاہ جی نے اپنی سفید براق چادر اوڑھ رکھی تھی اور سر پہ سبز رنگ کے کپڑے کی کاڑھی ہوئی گول ٹوپی پہنے ہوئے تھے ۔ وہ اِس طرح بیٹھے تھے گویا روز مرہ کے اوقات میں مریدوں اور معتقدوں کی حاضری کے موقع پر بیٹھے ہوں ۔ صرف اُن کے آگے بچھے ہوئے بے لباس جسم اور اُس کے اُوپر چلتے ہوئے موٹی موٹی نیلی نسوں اور اُبھری ہوئی ہڈیوں والے ہاتھ نے ایک انوکھی سی فضا پیدا کر رکھی تھی ۔ شاہ جی کے ہونٹ وا نہ تھے ، مگر وہ حلق کے اندر سے ناک کے رستے ایک لمبی تان والی گہری گنگناتی ہوئی آواز پیدا کرتے جا رہے تھے جیسے کسی لَے کا وِرد کر رہے ہوں ۔ عجیب بات تھی کہ اِس لَے کو سُنتے اور اس منظر کو دیکھتے ہوئے بچے کے دل میں ذرہ بھر، ہیجانی کیفیت پیدا نہ ہوئی، بلکہ وہاں کھڑے کھڑے اُسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا اُس کا دِل آہستہ آہستہ بیٹھتا جا رہا ہے ۔ دفعتاً اس کے دِل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ جسم نہ سویا پڑا تھا نہ ہی بیہوش تھا، بلکہ مُردہ حالت میں تھا ۔ دیر تک تاک لگائے وہ اُس بند چہرے کو دیکھتا رہا جس میں رتّی برابر حرکت کے آثار نہ تھے، اور اُس آواز کو سُنتا رہا جو کسی دوسری دنیا سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی ۔ رفتہ رفتہ اُس کے دِل میں یہ خیال یقین کی صورت اختیار کر گیا کہ فرش پہ پڑی ہوئی وہ ایک لاش تھی، اور شاہ جی اُسے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ اُسے گمان تھا کہ شائد کچھ دیر میں شاہ جی اُسے زندہ کر لیں، مگر اُسے تک زندگی ناپید تھی اور کمرے کی فضا پر موت کا سایہ تھا ۔ وہ بے آواز پاؤں سے پلٹ کر کمرے سے نکل آیا ۔

• واپسی پر وہ احاطے کے گیٹ سے نکلا تو کُتا جو اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا، اُٹھ کر ساتھ ہو لیا اور سر جُھکائے سُستی سے بچے کے پیچھے پیچھے چلنے

2009/08/23 14:05

لگا ۔ گھر کے صحن میں قدم رکھ کر بچے نے کتے کو اندر داخل کیا اور دروازے کی کنڈی چڑھادی ۔ پھر اپنے پلنگ کے پاس پہنچ کر اُس نے مچھر دانی کا پلّو اٹھایا اور بستر پہ چڑھ کر لیٹ گیا ۔ صحن میں چاندنی کا رنگ سیاہی مائل ہوچکا تھا ۔ بچے نے نہ مچھردانی کی موری بند کی اور نہ ہی تازی کی چارپائی پہ نظر ڈالی ۔ اُس کی آنکھوں میں وہی دوسری دُنیا کا منظر گھوم رہا تھا جو ابھی سے گرمیوں کی رات کے ایک سوتے جاگتے خواب کی کیفیت لئے ہوئے تھا ۔ دیر تک اُسے نیند نہ آئی اور وہ بستر پہ سیدھا لیٹا مچھر دانی کی جالی کے اندر سے آسمان کو دیکھتا رہا ۔ آدھی رات کا جادُو جو اپنے صحن کے اندر اُس کے بدن میں جاگا تھا اب بچے کے دِل سے ہُوا ہو چُکا تھا، جیسے پل کے پل کو لپک مار کر موت کی نیند سوگیا ہو ۔

2009/08/23 14:06

باب دوئم

موضع رکھوال کے دو دوست :۔

چوہدری برکت علی (مرحوم) موضع رکھوال کے ایک معمولی زمیندار تھے ۔ یہ اُن کی حیات کے زمانے کا ذکر ہے ۔ وہ جاٹ برادری کی قوم چوہان سے تعلق رکھتے تھے ۔ چوہانوں کی رکھوال اور گردو نواح کے موضع جات میں اکثریت آباد تھی ۔ چوہدری برکت علی چند ایکڑ آبائی زمین کے مالک تھے ۔ اِس کے علاوہ ایک مُربّع زمین اُن کے نیچے تھی جِس کی وہ ٹھیکے پر کاشت کرتے تھے ۔ اُن کا کُنبہ جو اُن کی ماں ، ایک کنواری بہن، ایک بھائی جو ذہنی توازن کے لحاظ سے قدرے کمزور تھا ، اور برکت علی کی دو بیویوں پر مشتمل تھا ۔ پیسہ وافر نہیں تھا ، مگر گیلی سُوکھی اجناس کی اُن کے ہاں قِلّت نہ آتی تھی، جِس کی بدولت کُنبے کے افراد دو وقت کی روٹی سال بھر فراغت سے پل جاتا تھا ۔ اُن کے گھر میں اگر کسی شئے کی کمی تھی تو وہ اولاد کی تھی ۔ چوہدری برکت علی کی پہلی شادی اپنے چچا کے گھر ہوئی تھی ۔ اُن کی بیوی عمر میں اُن سے کئی سال بڑی تھی ۔ اس شادی سے اُنہیں اولاد حاصل نہ ہوئی ۔ آدمی نہایت شریف الطبع تھے، کئی برس تک صبر و شکر سے انتظار کرتے رہے ، دُور دُور تک پہنچ کر دُعائیں کروائیں ، تعویز گنڈے کئے ، منتیں مانیں ، چڑھاوے چڑھائے، مگر کامیابی نہ ہوئی ۔ اِس کے باوجود اولاد کی خواہش اُن کے دِل سے نہ گئی ۔ آخر چالیس کے لگ میں تھے کہ دوسری شادی کا ارادہ کر لیا ۔ کچھ مشکل اِس وجہ سے پیش آئی کہ تو اُن کی عمر بڑی ، اُوپر سے پہلی شادی کی موجودگی ، پھر ایسی بات بھی نہ تھی کہ پیسے کی ریل پیل ہوتی ، چنانچہ باوجود تلاش کے اچھا رشتہ دستیاب نہ ہوا ۔ اسی میں ایک آدھ سال گُزر گیا ۔ آخر میں اپنے سے نیچی قوم کی ایک نوجوان بیوہ سے چوہدری برکت علی نے نکاح کے بول پڑھوا لئے ۔ اور اُسے گھر لے آئے ۔ اس

2009/08/23 14:06

کے بعد از سرِ نو اولاد کا انتظار شروع ۔ آج کل ، آج کل کرتے دِن نکلتے گئے، دنوں کے مہینے اور مہینوں کے سال بن گئے اور اولاد کی صورت نا پید ۔ چوہدری برکت علی اب پچاس کے سن کو پہنچنے والے تھے اور اپنی تقدیر کو خُدا کے ہاتھ میں دے کر دُنیا سے مایُوس ہو چکے تھے کہ ایک واقعہ رُونما ہوا جِس نے اُن کی زندگی بدل کے رکھ دی ۔ اس کی جو کہانی مشہُور ہے وہ کچھ اِسطرح ہے : ایک روز کوئی فقیر گاؤں میں آنکلا ۔ نمبرداروں اور مہاجنوں کے گھر چھوڑ کر وہ چوہدری برکت علی کے دروازے پر پہنچا اور صدا دے کر جواب کا اِنتظار کئے بغیر وہیں بیٹھ گیا ۔ گرمیوں کے دِن تھے ۔ برکت علی کی بیوی نے اُسے دو کٹورے ٹھنڈی لسّی کے پلائے ۔ فقیر خدا جانے کب سے پیاسا چلا آرہا تھا، غٹ غٹ پی گیا ۔ چوہدری برکت علی جنس اجناس کی فروخت کے سلسلے میں لاہور شاللمار کی منڈی گئے ہوئے تھے ۔ جب شام کو لوٹے تو فقیر کو دھرنا مارے دروازے پر بیٹھے پایا ۔ چوہدری برکت علی خُدا خوف اور دِل کے سخی تھے ، فقیر کو پیٹ بھر کھانا کھلایا اور آرام کے لئے چارپائی ڈال کر دی ۔ مگر فقیر نہ اُٹھ کر چارپائی پہ بیٹھا نہ ہی لیٹ کر سویا بلکہ رات بھر وہیں دیوار سے ٹیک لگائے زمین پہ بیٹھا رہا ۔ صُبح سویرے اُس نے صرف لسّی کا ایک کٹورہ پیا اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا ۔ مگر جانے سے پہلے برکت علی سے مخاطب ہو کر بولا ، 'مانگ کیا مانگتا ہے'۔ برکت علی نے جواب دیا شکر ہے، خدا کا دیا سب کچھ موجُود ہے، بس بخشش کی دُعا کریں ۔ فقیر نے کہا ، "تم زمین پر فرشتے کی صورت نازل نہیں ہوئے کہ ضرورتمند نہ ہو، تم آدمی کی ذات سے ہو اور آدمی کا امتحان خُدا کی رضا میں یہی ہے کہ اس کی ضرورتیں پُوری ہونے میں نہ آئیں ۔ فقیر کی دین کو مت ٹھکراؤ بولو تُمہارے دِل میں کیا ہے ۔" اِس پر چوہدری برکت علی نے دِل کا مُدعا بیان کیا ۔ فقیر نے کہا "جاؤ آج رات کو تمہیں خوشنودی ہوگی" یہ کہہ کر فقیر چل دیا ۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ جاتے جاتے وہ چوہدری برکت کو قرآن کی دو سطروں کا وظیفہ پڑھنے کو بتاگیا ، البتہ یہ دو سطریں آج تک کسی کے عِلم میں نہ آئی تھیں ۔ خُدا جانے یہ اُس وظیفے کا عِلم تھا یا کہ فقط فقیر بول کی عنایت تھی، چوہدری برکت علی کو اُس رات خواب میں خوشنودی ہوئی اِس کا ذکر یوں کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے دیکھا وہ ایک شجر کے نیچے کھڑے جِس کی ٹہنیاں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں ۔ مگر یہ پھل ہیرے جواہرات کی شکل

2009/08/23 14:06

میں ہیں اور اِن سے روشنی کی شعاعیں نِکل نِکل کر چاروں طرف پھیل رہی ہیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے مشرق کی جانب سے سورج نِکل آتا ہے ۔ صبح کی دُھوپ میں پھلوں کی چمک چوند اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جِس سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں ۔ چوہدری برکت علی گھبرا کر آنکھوں پہ ہاتھ کا سایہ کر لیتے ہیں ۔ خواب ختم ہو جاتا ہے ۔ اِس خواب کی تعبیر یُوں بیاں کی جاتی تھی کہ ان کے ہاں جو بچہ تولّد ہوگا اُس کے نام کی روشنی عالم میں چار دانگ پھیلے گی ۔ چوھدری برکت علی کو ناموری سے غرض نہ تھی ۔ اُنہیں تو فقط اولاد چاہیے تھی ۔ قدرت کے کرشموں کا آخیر کس نے دیکھا ہے ۔ جِس کسی پہ رحمت کی بارش ہو وہی دُنیا میں سردار ۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ چوہدری برکت علی کو خبر ہوگئی ۔ اُن کی چھوٹی بیوی کو حمل ٹھہر گیا تھا ۔

رمضان کے مُبارک مہینے کی یکم تاریخ کو اللہ تعالےٰ نے فقیر کی دُعا سے چوہدری برکت علی کو اولادِ نرینہ سے نوازا ۔ اُسی روز افطاری کے وقت پر اُنہوں نے ایک دیگ چاولوں کی پکوا کر گاؤں میں تقسیم کی، باقی کی خوشیاں رمضان المبارک کے احترام میں عید کے موقع تک کے لئے اُٹھا رکھیں ۔ شکرانے کے طور پر بہر حال اُنہوں نے اُسی وقت دو رکعت نفل ادا کر کے خُدا سے وعدہ کیا کہ وہ تیس کے تیس روزے آٹھ پہرے اُٹھائیں گے ۔ مزید یہ کہ آج سے وہ پنج وقتی نماز کے علاوہ باقاعدگی سے تہجّد گزار ہوں گے ۔ شکرانے کا فرض ادا کرنے کے بعد اُنہوں نے دُنیا داری کے کاموں کی جانب توجہ دینے کی کوشش کی ، مگر اُن کا دِل کِسی بات پہ نہ لگا ۔ اُن کے پاؤں زمین پہ ٹِکنے کو نہ آتے تھے ۔ اُنہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج وہ نئے سِرے سے جوان ہوگئے ہوں ۔ آخر سب کام کاج چھوڑ چھاڑ کر وہ گھر کے اندر زچہ کے پاس جاکر بیٹھ گئے اور بے جھجک ٹکٹکی لگا کر ایک پہر تک اُس ننھی سی جان کو دیکھتے رہے ۔ انتہائی مُنحنی سے چہرے پر اُنہیں نُور کی جھلک نظر آنے لگی تھی ۔ فرزند کا نام اُنہوں نے کرامت علی تجویز کیا ۔

کرامت علی نہایت تیزوطرار اور مضبوط بدن بچہ نکلا ۔ چوہدری برکت علی کو بڑھاپے میں نئی زندگی ملی تھی ۔ اُنہوں نے اپنے بیٹے کی ایک بیش بہا اور نایاب پودے کی مانند پرورش کی ۔ کرامت علی معمولی شکل وصورت کا تھا ، قد بھی لمبا نہ تھا، مگر جِسم خُوب گٹھا ہوا اور گردن بیل کی طرح موٹی تھی ۔ ماں

2009/08/23 14:07

باپ کی جانب سے وافر پیار و محبت کے علاوہ اُسے حیثیت سے بڑھ کر دُنیاوی نعمتیں مُہیا ہوئیں ۔ نتیجے کے طور پر کرامت علی ایک بے خوف اور پُر اعتماد نوجوان نِکلا ۔ کھیل کود کا شوقین ، کبڈی کا اپنے علاقے کا مانا ہوا کھلاڑی ، اِس پہ طرہ یہ کہ دماغ کا بھی ذہین ۔ میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا ۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تعلیم کا ایک معیار قائم تھا اور دُنیا میں اس کی قدر و قیمت تھی ۔ کرامت علی کا جی کالج کی پڑھائی کی جانب راغب ہوا ۔ چوہدری برکت علی مُصِر تھے کہ کرامت علی گاؤں میں رہے اور کاشتکاری میں اُن کے ساتھ شریک ہو ۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر بیٹے کے دو بازو اُن کے ساتھ آ شامل ہوں تو وہ مزید ایک مربع ٹھیکے کی زمین اپنی کھیتی میں رکھ سکتے ہیں ۔ مگر کرامت علی کو اعلےٰ تعلیم کا شوق چرایا ہوا تھا ۔ اُس کے سامنے باپ کی ایک نہ چلی ۔ چنانچہ کرامت علی نے اسلامیہ انٹر کالج میں جو اُن کے گاؤں سے نو میل کے فاصلے پر واقع تھا، داخلہ لے لیا اور روزانہ سائیکل پر آنا جانا شروع کر دیا ۔ تعلیم کے شوق کے علاوہ کالج میں کرامت علی کی سب سے بڑی دِلچسپی کا باعث فیروز شاہ کے ساتھ اُس کی دوستی تھی ۔ اِن دو نوجوانوں کی ہمدمی کی جڑیں بُہت گہری اور پیچدار تھیں ۔

فیروز شاہ ایک پیش امام کا بیٹا تھا ۔ اپنی معمولی حیثیت کے باوجود فیروز شاہ بھی کرامت علی کی مانند قدرتی اوصاف سے مالا مال تھا ۔ سکول کے زمانے سے ہی ان دو بچوں کی آپس میں دوستی تھی اور ساتھ ہی ساتھ رقابت کا انداز بھی تھا ۔ ہر سال کلاس میں اُن کا مقابلہ رہتا ۔ کبھی ایک کے نمبر زیادہ ہو جاتے کبھی دوسرے کے ۔ جب ذرا جوان ہوئے تو مقابلہ پڑھائی کی حدوں سے تجاوز کرگیا ۔ اُن کی دریافت کا سلسلہ وسیع ہوا تو گاؤں کی لڑکیاں اُن کے دائرۂ اشتیاق میں شامل ہوئیں ۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کا رن اب کبڈی کے میدان میں پڑنے لگا ۔ دونوں اس کھیل کے جوانمرد تھے ۔ جہاں فیروز شاہ کبڈی لینے کا ماہر ، وہاں کرامت علی پکڑنے کا مشاق ۔ فیروز شاہ کا قدم ایسا کہ سانس توڑے بغیر پُورے قد کے آدمی کو کھڑے کھڑے ٹاپ جاتا اور بدن پہ ہاتھ نہ لگنے دیتا تھا ۔ کرامت علی کا شکنجہ یوں کہ ہوا میں کلائی کو اُچک لیتا اور پھر ہاتھ کٹے تو کٹے ، کلائی پنجے سے نہ چھٹتی ۔ ساتھ ہی کمر پہ قینچی ایسی لگاتا کہ سامنے آ کر زور آور سے زور آور جوان کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی ۔ یہ

2009/08/27 12:29

مردوں کا رَن اور جوان ہوتے ہوئے لڑکوں کے اِفتخار کا پیمانہ تھا ۔ ان میدانوں میں مقابلہ کرتے دونوں پل کر جوان ہوئے ، میٹرک پاس کیا، اور کالج میں دونوں ایک دوسرے کی شہ پہ اکٹھے داخل ہوئے ۔ دونوں بیشتر اکٹھے دکھائی دیتے، گو ان ساری باتوں میں اگر دیکھا جائے تو فیروز شاہ کا پلّہ قدرے بھاری نظر آتا تھا ۔ میٹرک کے امتحان میں اُس کے نمبر بیس ہی زیادہ تھے مگر وہ فرسٹ ڈویژن میں جا پہنچا تھا ۔ کبڈی کے اندر اس کا انتخاب ڈویژن کی پہلی ٹیم کے سٹار کھلاڑی کی حیثیت سے ہوتا تھا جبکہ کرامت علی ریزرو ٹیم میں ہی رہ جاتا ۔ ظاہری خوبصورتی میں بھی فیروز شاہ کا نمبر اُونچا تھا ۔ وہ لمبے قد کا، سڈول جسم والا خوش شکل نوجوان تھا، جس کی بدولت صنفِ نازک کے درمیان اُس کی کشش نسبتاً زیادہ تھی ۔ لہٰذا عشق عاشقی کے معاملے میں بھی جیت اکثر اُسی کی ہوتی تھی ۔ تاہم ان دونوں کی آپس کی دوستی کبھی نہ ٹوٹی ۔

سن چھیالیس سینتالیس کا زمانہ تھا، تحریکِ آزادی زوروں پر تھی ۔ فیروز شاہ کالج میں پہنچتے ہی طالب علمی سیاست میں کود پڑا ۔ اُس کے اندر لیڈر شپ کی قدرتی صفات موجُود تھیں ۔ گو وہ پہلے سالوں کا طالبعلم تھا، مگر اپنی زور دار شخصیت کی بدولت دوسرے سال کے اوائل میں ہی کالج کی سٹوڈنٹ مسلم لیگ کا سیکرٹری مُنتخب ہوگیا ۔ کرامت علی کا مزاج فطری طور پر سیاست پسند نہیں تھا ۔ مگر فیروزشاہ کی دوستی میں وہ بھی اس میدان میں سرگرم ہوگیا ۔ اسی دوران میں ان دونوں کی نظر رضیہ سُلطانہ پہ پڑگئی ۔

رضیہ سُلطانہ کی کہانی :۔

سُلطان میر انبالے کے رہنے والے تھے اور ایک پُرانے علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ آباؤ اجداد مُغلوں کے زمانے میں درباری ہوا کرتے تھے ۔ عربی ، فارسی ، سنسکرت اُن کے گھر کی لونڈی تھی ۔ میر کے گھرانے کی یہ روایت نسل در نسل چلی آرہی تھی ۔ سلطان میر کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے حالات کے پیشِ نظر اتالیق گری چھٹ گئی، مگر انگریزی تعلیم کی بدولت چاروں کے چاروں بھائی سرکاری نوکری پہ لگ گئے ۔ سُلطان میر سال افسر کی کلرکی سے ہوتے ہوتے سکریٹریٹ کی ملازمت تک پہنچے اور آخر میں آکر رُکے ۔ کئی برس تک لاہور سکریٹریٹ کی مُلازمت کے بعد سینئر سیکشن افسر کے

2009/08/27 12:29

عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔ انہوں نے تیس برس کی عمر میں شادی کی ۔ اُن کی بیوی کا تعلق لاہور کے ایک کشمیری گھرانے سے تھا ۔ چنانچہ ریٹائر ہونے پر وہ لاہور میں ہی بس گئے ۔ لاہور شہر اُنہیں پسند تھا ۔ ملازمت کے آخری سالوں میں انہوں نے بیرون لاہور مغلپورہ کے علاقے میں ایک مکان تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا ۔ مکمل ہونے پر اُس میں منتقل ہوگئے ۔ اُنہیں خُدا نے بیٹے کی نعمت سے محروم رکھا ، مگر دو خوبصورت اور صحتمند بیٹیاں عطا فرمائیں ۔ اُن کے گھر کا طور طریقہ گو روایتی تھا ، مگر تعلیم کی روشنی سے منوّر تھا ۔ اپنی دونوں بیٹیوں کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم دِلوائی اور اپنے پاؤں پہ خود کھڑا ہونے کی تربیت دی ۔ بڑی لڑکی نے بی ۔ اے ۔ کیا اور مقامی سکول میں ملازمت اختیار کرلی ۔ دو چار سال میں اُس کی شادی ہوگئی اور دو بچوں کی ماں بننے کے بعد گھر گرہتسن ہو کر بیٹھ گئی ۔ سلطان میر کی جیب سے مکان کی تعمیر اور بیٹی کی شادی پر عمر بھر کا جمع شدہ سرمایہ خرچ ہوگیا تھا ۔ چنانچہ اب اُن کی گزر اوقات صرف پنشن پر ہونے لگی ۔ ریٹائر ہونے پر اگر وہ کسی پرائیویٹ فرم میں نوکری کرنا چاہتے تو سابقہ تجربے کی بنا پر اچھی پوزیشن حاصل کر سکتے تھے ۔ مگر یہ بات اُن کے گوارِ خاطر نہ ہوئی ۔ خاندانی روایت کے مُطابق اُن کی طبعیت کا رجحان پڑھائی لکھائی کی جانب رہا ۔ سارا سارا دِن وہ قالین بچھے تختے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ، عینک ناک پہ رکھے ، عربی ، اور فارسی کے پُرانے پُرانے گمنام نسخوں کا مطالعہ اور ان کے تراجم کرتے رہتے ، اس اُمید پر کہ کبھی نہ کبھی کوئی اللہ کا بندہ ان پہ رقم خرچ کرکے ان کی نشرو اشاعت کا سبب بنے گا اور پھر خلقتِ خدا ان سے مستفیض ہو سکے گی ۔ نام پیدا کرنے کی خواہش اُن کے اندر مفقود تھی ۔ کہا کرتے تھے کہ اُن کا کام اگر کبھی لوگوں کے سامنے آیا تو نمبر ایک وہ دھیلہ بھر معاوضہ نہ لیں گے ، اور نمبر دو یہ کہ اُن کا نام و پتہ کہیں درج نہ ہو گا ۔ فقط ایک گُمنام دو حرفی تخلص مُترجم کی حیثیت سے صفحۂ کتاب پر آئے گا ۔ اُن کی خصلت میں بے غرضی کی ایک رَو تھی جس کے اندر زندگی گزارتے ہوئے وہ مکمل طور پہ مُطمئن تھے ۔ گھر میں اب سوائے میاں بیوی کے صرف ایک بیٹی ہی رہ گئی تھی ۔ رضیہ سلطانہ اُن کی چھوٹی بیٹی تھی ۔

رضیہ سلطانہ کی عمر گھر میں سب سے چھوٹی اور مزاج سب سے الگ تھا ۔ اُس کا قد درمیانہ ، رنگ سفید ، بدن دُبلا پتلا اور خدوخال چہرہ گول جس پہ فراخ ماتھا

2009/08/27 12:27

اور لمبی پلکوں والی چلبلاتی ہوئی آنکھیں تھیں جنہیں وہ ہر بات سے پہلے متعدد بار جھپکا کرتی تھی ۔ پُشت پہ سیاہ دراز بال کمر کے نیچے تک لٹکتے تھے ۔ وہ ایسے لوگوں میں سے تھی جن کے اندر ایک برقی رَو دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جس سے اُن کا بدن ہر لحظہ تھرکتا ہے اور حرکت ایک پل کو نہیں رُکتی ۔ اپنی طبعیت کے لحاظ سے وہ ایک آفت کا پرکالہ تھی ۔ وہ دھیملپن جو اس کے خاندان والوں کا ایک وصف جانا جاتا تھا، رضیہ سلطانہ میں نام کو نہ تھا ۔ ہر بات میں اُسے شرارت سوجھتی تھی اور ہر چیز میں مذاق کا پہلو نکال لیتی ۔ گو ذہن کی تیز تھی مگر پڑھائی لکھائی سے زیادہ سرو کار نہ رکھتی تھی ۔

اِس کے بجائے وہ کھیل کُود ، بحث مباحثہ، تھیٹر ڈرامہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی ۔ ان باتوں کے علاوہ جو شے اُسے ایک بالکل الگ شخصیت عطا کرتی تھی وہ اُس کا خاص الخاص مزاج تھا ۔ وہ بے غرضی جو اُس کے باپ دادا کی خصلت کا ایک اہم جُزو تھی، رضیہ سلطانہ میں عنقاء تھی ۔ وہ ہر شے کو جانچنا، پرکھنا ، چکھنا ، حاصل کرنا اور قابو میں کر لینا چاہتی تھی ۔ اُس کے وطیرے میں ایک ایسی لپک تھی کہ جیسے وہ زندگی کے لحظے لحظے کو ہوا میں سے نوچ لینا چاہتی ہو ۔ اُس کے انگ انگ میں ایک ایسی حِرص تھی کہ جیسے دنیا کے عارضی ہونے کا علم اُس کے خون میں ہو اور وہ دُنیا کو تھام کر رکھنا چاہتی ہو ۔ جب وہ کالج میں گئی تو اسی وصف کی بنا پر سیدھی کالج کی سیاست کے عین بیچ میں جا ٹپکی ۔ گروپ بازی تو اُس کا مشغلہ تھا ہی ، سکول سے نِکل کر کالج کی کھلی سیاست میں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ گویا پیدا ہی اس مقصد کی خاطر ہوئی تھی ۔ دو سال کے اندر اندر وہ زنانہ سٹوڈنٹ لیگ کی عہدیدار بن گئی ۔ یہ وہ وقت تھا جب فیروز شاہ اور کرامت علی ، جِن کا کالج زنانہ کالج سے تھوڑے فاصلے پر واقع تھا، اور جو رضیہ سلطانہ سے ایک سال پیچھے تھے، اپنے طور انہیں سرگرمیوں میں اُلجھوئے تھے ۔ اُنہوں نے اِس آدھے نقاب سے ڈھکے چہرے والی، لمبے سفید کھدر کا لہرا لہرا کر دُھواں دھار تقریر کرتی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور دونوں اپنے اپنے دِل کے پیچھے گنوا بیٹھے ۔ گو شہر کے فیشن ایبل اور امیر لڑکے ، اور کالجوں کی مشہور کھلاڑی بھی رضیہ سلطانہ (جو رجو میر کے نام سے مشہور تھی) کا دم بھرتے تھے، رضیہ کا ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ ایک جیسا تعلق تھا ۔ اب فیروز شاہ اور کرامت علی اِس میدان میں مقابلے پر اُترے ۔ آنے والے حالات کی روشنی میں کہا جا

2009/08/27 12:27

سکتا ہے کہ یہ اُن کا آخری مقابلہ قرار پایا =

دونوں نے بڑھ چڑھ کر سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں حِصہ لیا ۔ تقریروں اور مباحثوں ، جلسے جلوسوں ، لڑائی جھگڑوں ، عہدے بازی کی کشمکش کے ذریعے دونوں نے آگے آنے اور رضیہ کی نظروں میں چڑھنے کی کوشش کی ۔ آخر اِس کشمکش میں بھی فیروزشاہ کا پلّہ ہی بھاری رہا ۔ رضیہ کی طبعیت کا میلان فیروز شاہ کی جانب ہوتا گیا ۔ اِس میدان میں گو کہ آخری دم تک شہر کے دو ایک لڑکے موجود رہے ، مگر فیروزشاہ نے اس بے جگری سے اُس کا پیچھا کیا کہ آخر کار رضیہ کا دل جیت لیا ۔ کرامت علی، جِس کو اپنی دوستی ان سب باتوں سے زیادہ عزیز تھی، صُلح جُوئی کے ساتھ اِس صف آرائی سے ہٹ گیا ۔ مگر اس سارے قضے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پڑھائی میں تساہل کے باعث کرامت علی دوسرے سال کے سہ ماہی امتحان میں فیل ہوگیا ۔ چودہری برکت علی کو اس بات کا بہت رنج پہنچا، گو وہ منہ سے کچھ نہ بولے ۔ تاہم دو ایک ماہ مزید گزرنے پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جِس سے چوہدری برکت علی کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا ۔ سن سینتالیس کی گرمیوں کا موسم تھا ۔ مغربی پنجاب کے چھوٹے بڑے شہروں میں گرفتاریاں پیش کی جا رہی تھیں ۔ سکولوں کالجوں میں لمبی چُھٹیاں ہو چکی تھیں ۔ کرامت علی گاؤں جانے کی بجائے شہر میں ہی اپنے ایک دوست کے ہاں رُک گیا ۔ آخر آٹھ دس روز کی کوشش کے بعد گرفتاریاں پیش کرنے والوں کی فہرست پر کرامت علی اور فیروزشاہ کا نام چڑھا ۔ پُھولوں کے باروں سے لدے ہوئے ، ڈھول کی دھمک کے ساتھ ایک جُلوس کی شکل میں چار آدمی نعرے لگانے والوں کے ہجوم میں گِھرے شالا مار کے چوک میں پہنچے جہاں جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کی جا چکی تھی ۔ وہاں پہ پولیس پہلے سے موجود تھی ۔ اُنہوں نے چاروں کو گاڑی میں بٹھایا اور تھانے کے اندر لے گئے ۔ اُس روز فیروز شاہ اور کرامت علی کی ایک دِلی خواہش پوری ہوگئی =

گاؤں میں جب چوہدری برکت علی کو اس کی خبر پہنچی تو اُن پر گویا آفت ٹوٹ پڑی ۔ اُنہیں اِس بات کا گُمان تک نہ تھا کہ اُن کا بیٹا سیاست میں ملوّث ہے ۔ بیچارے سیدھے سادے شریف آدمی ، ایک بیٹے کی جان اُن کی زندگی کا سہارا تھی ۔ گرفتاری کی خبر سُن کر سخت گھبرا گئے ۔ اُن کا دل ڈوبنے لگا اور سر میں چکر آگیا ۔ وہ چارپائی پہ لیٹ گئے ۔ جب دل کچھ ٹھہرا تو اُٹھے گاؤں کے

2009/08/27 12:29

ایک باحیثیت زمیندار کو ساتھ لیا اور جاکر ضمانت پیش کردی ۔ کرامت علی نے لاکھ عُذر پیش کئے ، باپ کو سمجھایا بُجھایا، بتایا کہ یہ گرفتاری باعثِ شرم نہیں ، باعثِ افتخار ہے ، یہ قید عام قیدوں کی مانند جان پہ بن آنے والی نہیں بلکہ عیش و آرام میں گزر رہی ہے ۔ گپ شپ، کھانا پینا ، اُٹھنا بیٹھنا، میل ملاقات، سب سلسلے آسان ہیں، اور جلد ہی عزت داری سے اس کا انجام ہوگا ۔ مگر چوہدری برکت علی کا دل نہ مانا ۔ اُنہوں نے بیٹے کو اپنی پگڑی کا واسطہ دیا اور بضد رہے ، دھمکی دی کہ وہ وہیں حوالات کے دروازے پہ ڈیرہ جما کر بیٹھ جائیں گے اور اس گھڑی تک بُھوکے پیاسے بیٹھے رہیں گے جب تک کہ کرامت علی قیدخانے سے اُن کے ہمراہ گھر کو نہ چل دے گا ۔ آخر کرامت علی کی اُن کے سامنے ایک نہ چلی ۔ اُدھر پولیس اور انتظامیہ والے ان لوگوں سے چُھٹکارا حاصل کرنے کو تیار کھڑے تھے ۔ ضمانت قبول کرکے اُنہوں نے سارے کاغذات پہلے ہی چوہدری برکت علی، اُن کے ضامن ، اور کرامت علی کے ہاتھ میں دے دیے تھے ۔ چنانچہ اُسی روز شام کے وقت کرامت علی اپنے دوسرے ساتھیوں اور ملاقاتیوں سے گلے مل مل کر رُخصت ہوا ۔ اُن سب کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔ دو روز پہلے جب وہ وہاں پہنچا تھا تو اپنے ہمراہ ایک دُنیا کو لے کر آیا تھا ۔ ڈھول کی تھاپ پہ ناچنے والوں اور خون کھولا دینے والے نعرے لگانے والوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو اُسے کندھوں پہ اُٹھائے تھا ۔ آج وہاں سے تنہا نکلتے ہوئے اُسے محسوس ہو رہا تھا گویا واقعتاً وہ گُنہگار ہو اور رات کے اندھیرے میں جیل سے فرار ہو رہا ہو ۔ اُس کے دِل میں شرمساری اور ایک سُن کر دینے والی اُداسی کی کیفیت تھی ۔

گاؤں میں کرامت علی کا جی اُکھڑا اُکھڑا رہا ۔ چوہدری برکت علی نے ایک بار پھر اپنی سی کوشش کر دیکھی کہ اُن کا بیٹا کاشتکاری کی جانب متوجہ ہو اُن کے ساتھ شریک ہو کر گھر باہر کی ذمہ داری سنبھالے ۔ مگر کرامت علی کا دل گاؤں کی زندگی سے اُٹھ چکا تھا ۔ اُدھر فیروزشاہ کے قدم سیاست کے میدان میں بڑھتے جارہے تھے ۔ اُس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور شہر میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی ۔ پہلے وہ ایک دوست کے ہاں قیام پذیر رہا، بعد میں ایک دوکان کے چوبارے میں کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگا ۔ سیاست کے علاوہ اُس کا کوئی دھندا نہ تھا ۔ اُس کے باپ کی چند ایکڑ زمین تھی جس کی آمدنی سے کچھ حصہ اس کا باپ اپنا پیٹ کاٹ کر بیٹے کو دے دیتا تھا ۔ باقی اخراجات اُس کے

2009/08/27 12:29

دوستوں کی مدد امداد سے چلتے تھے ۔ فیروزشاہ اُن نادر جوانوں میں سے تھا جو قوم و وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں اور جن کے دِل میں سوا اس کے کوئی غرض نہیں ہوتی ۔ وہ وقت ہی ایسا تھا ۔ اس سرزمین نے اُس دور میں ایسے نوجوانوں کی ایک کھیپ پیدا کی جو بعد میں اسی زمانے کے ہاتھوں غرق ہوئے ۔ اُس پُر خطر دور کا ایک یہ بھی خاصہ تھا، کہ جس جوش جذبہ سے جوانوں نے ستاروں پہ کمند ڈالی ، زمانہ بدلا تو اسی کے زور نے اُنہیں برباد بھی کر ڈالا ۔ فیروزشاہ اُس وقت چڑھائی کی روش پہ تھا ۔ رضیہ سلطانہ ، جو برق صفت طبیعت کے باعث اپنی سفید پوشی کی زندگی کے نہ جانے کتنے چرکے کھائے بیٹھی تھی، اور جِس کی بدولت اس کا مزاج ایک ڈھب پہ اُستوار ہوتا چلا جا رہا تھا ، فیروزشاہ کی اسی بے غرضی کے سبب بُری طرح سے اپنا دِل اُسے دے بیٹھی ۔ دونوں ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے ۔ رضیہ سلطانہ نے تعلیم ترک نہ کی ، مگر سیاسی سرگرمیوں میں بدستور فیروزشاہ کے پہلو بہ پہلو حِصہ لیتی رہی ۔

کرامت علی کو ان سب باتوں کی برابر خبر ہوتی رہتی تھی ۔ گاؤں میں وہ گھر کے اندر ، یا کھیتوں میں پیڑوں کے تلے پڑا ستایا کرتا ، پھر ہر دوسرے چوتھے دن وہاں سے اُٹھ کر فیروزشاہ کو ملنے شہر چلا جاتا اور کبھی کبھار رات وہیں بسر کر کے آتا ۔ گو اُن کی زندگیوں نے اپنے اپنے رخ اختیار کر لئے تھے ، اُن کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا ۔ یہاں تک کہ رضیہ سلطانہ بھی، جو اپنی عام مقبولیت کے باوجود صرف چند ہی ذاتی دوست رکھتی تھی، اُسے اپنے قریبی ساتھیوں میں شمار کرنے لگی تھی اور ہر بات میں اُس کے صلاح مشورے کو اہمیت دیتی تھی ۔ صرف ایک بات تھی جِس کی خلش کرامت علی کو محسوس ہوتی رہتی تھی ۔ اُس نے آج تک رضیہ کی شکل نہ دیکھی تھی ۔ شروع دِن سے لے کر جب بھی اُن کا سامنا ہوا، خواہ مُختصر خواہ لمبی ملاقات ہوئی ، کرامت علی کے روبرو رضیہ سلطانہ کی وہی شکل و صورت رہی جو باقی دُنیا کی نظر میں آئی ۔۔۔۔۔ سیاہ یا ہلکے نیلے رنگ کے نقاب سے آدھا پونا جسم اور ناک ہڈی تک کا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا ، سر کے بال اسی نقاب کے سکارف تلے آدھے ماتھے تک بندھے ہوئے اس طرح کہ صرف اس کی آنکھیں اور ابرو گالوں کی ہڈی تک رُخسار ، اور لمبی لمبی انگلیوں والے ہاتھ ہی نظر آتے اور یہاں پر اُس کی عریانی کی حد تک ختم ہو جاتی ، جیسے کہہ رہی ہو کہ بس، اس سے آگے کسی کا حق نہیں بنتا ۔۔۔۔۔ اس سے آگے ایک اسرار کا جہاں شروع ہوتا تھا جِس کی شدید کی

2009/08/27 12:30

ابھی تک، گو اب وہ رضیہ کا پیچھا کرنا ترک کر چُکا تھا، بے پناہ کشش کی حامل تھی ۔ بس ایک تمنّا اُس کے دل میں کبھی کبھار پیدا ہوتی تھی، کہ کاش وہ ایک بار اس عورت کا پورا چہرہ ہی دیکھ سکتا ، اُس کے اسرار کے امکان کا ایک نظر جائزہ ہی لے سکتا ۔ یہی بے سُود تمنّا اُس کے دل میں کسی نہ کسی جگہ فیروزشاہ کے لئے حسد کا ایک بے معلوم سا جذبہ رکھنے کا باعث بھی تھی ۔ کبھی کبھار جب وہ گمان میں ہوتا تو اپنے آپ کو فیروزشاہ کی جگہ پہ پاتا اور پھر اس حالت میں وہ رضیہ سلطانہ کے پردوں کے زیر زیر رینگتا ہوا اُس کے اسرار معلوم کرنے کی کوشش کرتا ۔ اس عالم میں وہ دیر تک کبھی اندھیرے اور کبھی روشن پردوں کے بیچ بیچ گھومتا رہتا اور جب نکلتا تو نیم سیر ہو چکا ہوتا ۔ اس کے باوجود جب بھی وہ فیروزشاہ اور رضیہ سے جاکر ملتا ، اس قسم کے خیالات اُس کے دل سے کوسوں دور ہوتے ۔ بیشک اُن دونوں سے کرامت علی کے تعلقات محض دوستانہ حد تک تھے، مگر اس بات کا بھی اسے علم ہو چلا تھا کہ دل کی باتوں کا ظاہر کی باتوں سے تعلق خال خال ہی ہوتا ہے ۔

اِنہی سرگرمیوں کے دوران فیروز شاہ نے دو ایک مزید عرصے جیل میں کاٹے ۔ جب پہلی بار کرامت علی ملاقات کی خاطر گیا تو فیروزشاہ بُہت خوشگوار موڈ میں تھا ۔ گپ شپ کے دوران مذاق کے طور پہ بولا، 'یار، تم نے پڑھائی تو چھوڑ ہی دی ہے ۔ کم از کم جیل میں ہی نوکری کرلو، اور کچھ نہیں تو ہم جیسے لوگوں کو کچھ سہولتیں ہی مل جایا کریں گی ۔ آج اخبار دیکھ رہا تھا، آسامیوں کا اشتہار بھی ہے'۔ کرامت علی سُن کر ہنس دیا ۔ لیکن اس بات نے، جو ظاہراً مذاق کی بات ہی تھی، اُس کے دِل میں ایک عجیب کُھد بُد پیدا کردی ۔ بار بار اُس کا دھیان اِس بات کی جانب جاتا اور اس کا خیال دِل میں گہرا ہی اُترتا جاتا ۔ جب سے چوہدری برکت علی اُسے زبردستی جیل سے نکلوا کر لائے تھے، کرامت علی کے دل میں ایک میخ گڑی تھی ۔ اُس کے ذہن سے یہ خلش نہ جاتی تھی کہ اپنے ساتھیوں کا ساتھ دینے میں وہ پورا نہیں اُترا ، کہ زندگی بسر کرنے میں اُس سے کوئی عظیم کوتاہی ہوئی ہے ۔ جِس بے لوث جرأت کا مظاہرہ فیروزشاہ اور رضیہ سلطانہ نے کیا ہے ، اُس قربانی کا وہ مُتحمّل نہیں ہو سکا ۔ اُس کے اندر کوئی ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ ایک چھوٹی سی شرمساری لئے لئے پھرتا تھا، جو ہردم اُسے تنزلی کا احساس دلاتی رہتی تھی ۔ اپنی ذات کے اِس نشیب سے نکلنے کی خاطر وہ لحظہ

2009/08/27 12:30

گویا اپنی اُنگلیوں کے ناخن دیوار میں گاڑے سر نکال کر اُوپر ہوا میں دیکھتا رہتا تھا ۔ جب فیروزشاہ نے مذاقاً اس بات کا ذکر کیا تو ایک لمحے کو یہ بات قطعی انہونی معلوم ہوئی ، پھر سیدھی اُس کے خیال میں جا اٹکی ۔ کیوں نہ جیل کی نوکری ہی کرلوں ؟ اُس نے سوچا ۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جس چیز نے اس خیال کو اکسایا تھا، وہ اس کے بالکل برخلاف جاتی تھی ، یعنی اُونچائی کو سر کرنے کی بجائے اُس نے مزید گہرائی کی جانب ہی راہِ فرار تلاش کرنے کی ٹھانی تھی ۔ انسان کی مختلف حرکات کے نشیب و فراز کی یہ بھی ایک عجیب کڑی تھی ۔

اگلے روز سب سے پہلا کام جو اُس نے کیا وہ پچھلے روز کے اخبار کی تلاش تھا ۔ اخبار ہاتھ لگا تو اُس نے مذکورہ اشتہار پڑھا ، درخواست لکھ کر سندوں کی کاپیاں ساتھ نتھی کیں ، کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرکے ساتھ جوڑا ، اور سارے کاغذات مکمل کرنے کے بعد درخواست مشتہر پتے پر روانہ کردی ۔ جواب آتے آتے کئی ہفتے لگ گئے ۔ اس کے بعد امتحان کے لئے حاضر ہونے کا بلاوا آیا ۔ امتحان میں ایک لکھائی کا پرچہ ملا اور ایک زبانی سوال جواب کا امتحان دو شخصوں پر مبنی بورڈ کے سامنے منعقد ہوا ۔ امتحان ختم ہونے پر ایک بار پھر ہفتوں کی انتظار شروع ہوئی ۔ اس سارے دوران میں کرامت علی نے اُس بارے میں ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا ۔ حسبِ دستور وہ ہر تیسرے چوتھے روز فیروزشاہ سے ملنے کے لئے جاتا، مگر فیروزشاہ کو اُس نے اس معاملے کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی ۔ کیوں اُس نے اس کا ذِکر نہ کیا؟ اس کی وجہ اتنی پیچیدگی کی حامل تھی کہ ٹھیک سے خود اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ اور باتوں کے علاوہ اس میں غالباً اس بات کی شرم بھی مانع تھی کہ اب اُس نے زندگی کو پرانے دوستوں سے کاٹ کر بالکل مختلف ڈھب پہ چلانے کا انتخاب کر لیا تھا ۔ بہر حال، جب نوکری کے لئے منتخب ہونے کی اطلاع بذریعہ ڈاک موصول ہوئی تو پھر وہ زیادہ دیر تک صیغۂ راز میں نہ رکھ سکا ۔

چوہدری برکت علی کا ردِّ عمل ملا جُلا تھا ۔ ایک طرف تو وہ ناخوش بیٹا کاشتکاری سے جانتا جانتا گاؤں سے ہی گیا ۔ ساتھ ہی ساتھ اُنہیں فخر اس کا بھی تھا کہ سیاست اور شہر کے دوسرے نکمّے کاموں سے نکل کر کرامت علی سرکاری نوکری پہ جا کھڑا ہوا ہے ۔ باپ سے نبٹ کر کرامت علی فیروزشاہ سے گیا اور اب سارا راز اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا ۔ فیروزشاہ یہ خبر سُنتے ہی

2009/08/27 12:31

تو دنگ رہ گیا ، پھر اتنے زور سے ہنسا کہ ساتھ والے کمروں سے لوگوں نے جھانکنا شروع کر دیا ۔ کرامت علی کے دل میں جتنے بھی شکوک اسی بات کے بارے میں پیدا ہوئے تھے وہ سب فیروزشاہ کی پُر خلوص ہنسی سے غائب ہو گئے ۔ ٹھیک ہے' فیروزشاہ بولا ۔ مکاؤں کی زندگی تو تمہیں راس آنے سے رہی، نوکری ہی کر کے دیکھ لو ہو سکتا ہے ایک دن بڑے افسر بن جاؤ ۔ اپنا ایک آدمی سرکاری افسر بھی ہونا چاہیئے ، ورنہ ہمارے کام کیسے چلیں گے؟۔

سب سے پہلا دھکا جو کرامت علی کو لگا وہ اُس کی تعیناتی کا تھا ۔ حالانکہ آسامی کے اشتہار میں اِس کی وضاحت تھی، اور زبانی امتحان میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ تعیناتی مُلک کے کسی حصے میں بھی ہو سکتی ہے ۔ مگر یہ بات اُس کے ذہن سے قطعی اُتر چکی تھی ۔ اُس کے خیال میں یہ بات کہیں سے پیدا ہو گئی تھی کہ وہ لاہور یا زیادہ سے زیادہ گردونواح کے کسی جیل خانے میں جا کر لگے گا ۔ جب اُس کی تقرری کا خط آیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا ۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں اُس کو چھ ماہ کی ٹریننگ کے لئے حاضر ہونے کا حکم آیا تھا ۔ دو دن تک وہ اس بارے میں سوچتا رہا ۔ کئی بار اُس نے ارادہ کیا کہ استعفٰے بھیج دے ، یا سرے سے حاضر ہی نہ ہو، پھر اِرادہ بدل دیا ۔ اُس نے سوچا کہ اتنی کوشش اور انتظار کے بعد اب کیا فائدہ ؟ چنانچہ مقررہ تاریخ پر سب سے مل مِلا کر کرامت علی اپنی ماں اور باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر گھر سے رُخصت ہوا ۔

اب کرامت علی کی شخصیت میں ایک اور تبدیلی رونما ہوئی ۔ ایک بار نوکری پر کھڑا ہو گیا تو آہستہ آہستہ اپنے مزاج کے اندر بدلنے لگا ۔ اُس نے دیکھا کہ جیل خانے کی نوکری فوج اور پولیس کی نوکری کی مانند چونکہ باوردی اور سپاہیانہ تھی، چنانچہ اس میں وہی ڈسپلن تھا ۔ اپنے سے نیچے والوں کے لئے حکم جاری کرتے ہوئے ، اور اُن کی تعمیل ہوتے دیکھ کر اندر ہی اندر اُس کو ڈسپلن بھانے لگا ۔ اپنے اختیارات کے دائرے میں جم کر بیٹھے ہوئے اُسے انوکھی طمانیت حاصل ہونے لگی ، یہاں تک کہ اُوپر والوں کے احکام بجا لاتے ہوئے بھی اُسے قوت اور سکون کا احساس ہوتا ۔ ہوتے ہوتے اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ نوکری کی کڑیوں کے اندر اختیار کی اصل طاقت حکم کے بجا لانے میں نہ کہ جاری کرنے میں ۔ اُوپر والے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے وہ، جوابدہی کی ذمہ داری سے آزاد ہو کر اپنے قول و فعل کا مالکِ کُل ہوتا ۔ اُسے پتا چلا کہ قوت

2009/08/27 12:31

کا سرچشمہ فرمانبرداری میں ہے ۔ نوکری کے اِن سلسلہ وار پردوں کے ہٹتے جانے سے اُس کا دِل وہاں لگنا شروع ہوگیا۔

چھ ماہ کی ٹریننگ کے بعد کرامت علی کی تقرری راولپنڈی کے جیل خانے میں ہوگئی ۔ ہر دوسرے چوتھے مہینے وہ کسی نہ کسی طور سے چھٹی حاصل کرکے گاؤں آتا اور گھر والوں سے ملنے کے علاوہ فیروزشاہ سے بھی مل کر جاتا ۔ ڈیڑھ دو برس اسی طرح گزر گئے ۔ خوش قسمتی سے اُن کے گاؤں کے دو آدمی سرکار میں اعلیٰ رُتبے کو پہنچ گئے تھے ۔ ایک اُن کی اپنی ہی جاٹ برادری کے چوہدری غلام محمد ، ذیلدار کا بیٹا فضل محمد فوج میں بریگیڈیئر ہوگیا تھا، اور دوسرا سیدوں کا ایک لڑکا نبی احمد وزارتِ خزانہ میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے کو جا پہنچا تھا ۔ ان دو اعلیٰ عہدیداروں کی وجہ سے گاؤں کی حالت کچھ سنورنا شروع ہوگئی تھی ۔ سرکاری کاموں میں 'منفی' دھاندلیوں کا امکان کم ہوگیا تھا، 'مثبت' دھاندلیوں کا امکان کچھ بڑھ گیا تھا ۔ افواہ تھی کہ پکی سڑک اور بجلی رکھوال میں آنے والی ہے ، اور گورنمنٹ کے ٹیوب ویل نسب کرنے کی سکیم بھی گاؤں تک بڑھادی جائے گی ۔ اس کے علاوہ سفارشی کاموں کا سلسلہ بڑھ چکا تھا ۔ چوہدری برکت علی نے بھی کہہ سُن کر دونوں افسروں تک بیٹے کی تعیناتی کے لئے سفارش چڑھادی تھی ۔ ایک مرتبہ تو کرامت علی چھٹی پر آیا ہوا تھا کہ سید نبی احمد ڈپٹی سیکرٹری بھی اتفاق سے رات کی رات کو گاؤں آئے ۔ کرامت علی نے باپ کے کہنے پر اپنی وردی پہنی اور اُسی وقت سید نبی احمد کے سامنے جا حاضر ہوا ۔ کس کر سلوٹ مارنے کے بعد اُس نے اپنی عرضداشت پیش کی ، جسے سُن کر نبی احمد نے ایک بار پھر اس کی مدد کا وعدہ کر لیا ۔ جب کبھی سید نبی احمد بریگیڈیئر فضل محمد کی مدد کے وعدے کی خبر کرامت علی تک پہنچتی ، اُسے ایک عجب سی خود اختیاری کا احساس ہوتا ۔ اور اُس کے اگلے چند ماہ اسی نشے میں گزر جاتے ۔

اُدھر فیروز شاہ سیاست میں بتدریج ترقی کرتا جارہا تھا ۔ اب وہ ضلع کے حلقے کی سطح تک پہنچ چکا تھا ، جس کی بدولت سرکاری دفتروں اور چھوٹے موٹے افسروں تک اُس کی رسائی تھی ۔ دِن دِن بھر غرضمندوں کو ساتھ لئے کچہریوں اور دفتروں میں اُن کے کام کرواتا پھرتا تھا ۔ ایک آدھ بار مزید حکومت کی مخالفت میں جیل کاٹ چُکا تھا ۔ اِس کے باوجود خبر گرم تھی کہ اگلے الیکشنوں میں اُسے صوبائی اسمبلی کے لئے ٹکٹ مل جائے گا ۔ رضیہ سلطانہ کے ساتھ اُس کا تعلق باقاعدہ قائم

2009/08/27 12:32

تھا ۔ رضیہ سلطانہ نے بی ۔ اے ۔ کرنے کے بعد گورنمنٹ سکول میں ملازمت کرلی تھی، مگر سیاست میں [illegible] بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی رہی تھی ۔ اُس کا ارادہ تھا اگر اِن کاموں کی وجہ سے اُسے ملازمت سے نِکال دیا جاتا ہے تو وہ اپنا پرائیویٹ سکول کھول لے گی ۔ فیروز شاہ کا کہنا تھا کہ اِس معاملے میں وہ اپنا اثر و رسُوخ استعمال کر سکتا ہے ۔ اور کسی دِقّت کے پیش آنے کا احتمال نہیں ۔

2009/08/27 ی 12:32

فیروزشاہ کے والد احمد شاہ عام دیہاتی امام مسجدوں سے ہٹ کر واقع ہوئے تھے ۔ وہ اپنی پرہیز کاری اور مذہبی علم و فضل کی بنا پر عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور گاؤں کی زندگی میں اُن کی خاص اہمیت تھی ۔ پھر کبھی کبھار فیروزشاہ کی تصویر مقامی سیاست کے سلسلے میں اخبار میں آجاتی تھی، جس کی وجہ سے گاؤں کے حلقے میں اُن کی حیثیت اور بھی اہم ہوگئی تھی ۔ اِدھر کئی برس سے وہ فیروزشاہ کی شادی کرنے کی فکر میں تھے ۔ یوں تو سب ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے بیٹوں کی شادی رچائیں ۔ مگر احمد شاہ کی اس فکر میں ایک خاص وجہ کا دخل تھا ۔ وجہ یہ تھی کہ اُن کے خاندان میں سات پُشتوں سے اکلوتی اولاد ہوتی چلی آرہی تھی ۔ دادا پردادا کے اُوپر سے لے کر جہاں تک شجرۂ نسب کا کُنبے برادری والوں کو عِلم تھا، اِس گھر کی لڑی میں یہی نہیں کہ اکلوتی نرینہ اولاد ہوتی بلکہ سرے سے ایک اکلوتی اولاد ہی ملتی تھی اور اس کے بعد سلسلہ بند ۔ یہاں تک کہ اُن کے بڑے بڑوں نے، جو سب کے سب مذہبی علوم سے مالا مال تھے ، چار چار نکاح تک اسی کوشش میں کئے تھے کہ وافر اولاد کی دولت ملے، مگر خدا کی قدرت کہ ایک سے زاید اولاد کسی کے نصیب میں نہ ہوئی تھی ۔ اسی تقدیر کی بدولت اُن کے گھرانے کی قریبی رشتہ داری نہایت قلیل افراد پر مُشتمل تھی اور اسی سبب کے باعث اُن کے گھرانے کا رواج تھا کہ نو عمری میں ہی بچے کی شادی کی رسم پوری کردیا کرتے تھے ۔ اب اس پیڑھی پر آکر فیروز شاہ نے اپنے آپ کو اِس قدیم رواج سے مُستثنےٰ قرار دے دیا تھا ۔ اس بات کا احمد شاہ کو دِلی دُکھ تھا ۔ اُن کا کہنا تھا کہ عمر بھر میں اُنہوں نے اللہ تعالےٰ سے صرف ایک ہی دُعا مانگی تھی، کہ خُدا اُنہیں پوتا عطا فرمائے ۔ ایک عرصے سے وہ اسی کوشش میں تھے کہ اچھا سا رشتہ تلاش کرکے فیروزشاہ کا نکاح کردیں ۔ اِس سلسلے میں متعدد بار وہ شریف گھرانوں میں پیغام لے کر گئے اور راضی بہ رضا

لوٹے تھے ۔ مگر فیروزشاہ تھا کہ کسی ڈھب پہ آتا ہی نہ تھا ۔ کبھی کسی بہانے کی آڑ لے لیتا کبھی کسی کی ، اور بعض [illegible] معاملہ ٹال دیتا ۔ احمد شاہ اپنے بیٹے کے رویے پہ آخر اتنے متذبذب ہوئے کہ قوتِ ارادی ہی کھو بیٹھے اور چپکے ہو کر گھر میں بیٹھ رہے ، بس عبادت پہ سارا وقت صرف کرنے لگے اور دُعا مانگتے رہتے کہ خُدا اُن کے بیٹے کو ہدایت دے اور نسل افروزی کی جانب مائل کرے ۔ کبھی جب کرامت علی سے ملاقات ہو جاتی تو کمال درد سے التجا کرتے کہ وہ اپنے جگری دوست کو سمجھائے اور سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرے، اللہ اُسے جزا دے گا ۔ ایک روز کرامت علی نے آخر فیروز شاہ سے سوال پُوچھ ہی لیا، کہ وہ رضیہ سُلطانہ سے شادی کیوں نہیں کرلیتا ۔ جواب میں فیروزشاہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا ، پھر بولا 'کیا کروں ، عجیب عورت ہے' کرامت علی نے پوچھا ، 'کیا کہتی ہے؟' فیروزشاہ بولا 'شادی نہیں کرتی' ۔ کرامت علی حیرت زدہ ہو کر اُسے دیکھنے لگا ۔ 'کیوں نہیں کرتی؟' پھر اُس نے پوچھا ۔ 'کیا خبر' فیروزشاہ نے جواب دیا ۔ 'تم خود ہی اُس سے کیوں نہیں پُوچھ لیتے؟' کرامت علی کی سمجھ میں بات نہ آئی ۔ اُس روز جب وہ فیروزشاہ سے رُخصت ہونے لگا تو دِل میں ارادہ کرچکا تھا کہ رضیہ سُلطانہ سے یہ راز معلوم کرکے رہے گا ۔ افسوس کہ وقت نے اُسے مہلت نہ دی ۔ اُسے رضیہ سلطانہ سے پوچھنے کا موقعہ ہی نہ ملا، اورایک وقت میں جاکر مِلا بھی تو اتنی دیر سے کہ پُوچھنے نہ پُوچھنے میں کوئی فرق نہ رہا ۔

صدی کی پانچویں دہائی کے اوائل تھے ، الیکشن کی خبریں زوروں پر تھیں ، کہ ہمارے ان چند کرداروں کے بیچ قدرت کی جانب سے چند ایسی تبدیلیاں رُونما ہوئیں کہ اُوپر کا نیچے اور نیچے کا اُوپر ہوگیا ۔ ایک طرف تو چوہدری برکت علی کے گھر میں اُن کے بیٹے کے عقد کا چرچا چلا، ساتھ ہی سفارشوں نے اپنا کام دکھایا اور کرامت علی کی تقرری لاہور کے ایک جیل خانے میں ہوگئی ۔ اُدھر دوسرے دو گھرانوں میں کہرام مچ گیا ۔

ایک روز صبح سویرے فیروزشاہ اپنے چوبارے میں مُردہ پایا گیا ۔ اُس کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا ۔ نعش پوسٹ مارٹم کے لئے گئی تو ڈاکٹر کسی دانستہ اور حتمی فیصلے پر نہ پہنچ سکے ۔ رپورٹ میں درج ہوا کہ موت حادثاتی طور پر اندرسے سانس گھٹنے کی بنا پہ واقعہ ہوئی ہے، گو بدن پہ اس کے کوئی بیرونی نشان موجود نہ

تھے ۔ چنانچہ قانون کی رُو سے معاملہ یہاں پہ ختم ہوگیا ۔ فیروزشاہ کے دوست احباب نے ، پیروکاروں نے خون کے آنسو رو رو کر ماتم کئے ، ہزاروں طرح کی افواہیں اُڑیں ، دُشمنی اور حسد کو موجب قتل ٹھہرایا گیا ، ناکامیٔ عشق موردِ الزام قرار پائی، کثرتِ فکر کو دماغ کی نس پھٹنے کی وجہ بتائی گئی ۔ مگر نتیجہ آخر کار وہی نکلا ، کہ موت نے حسبِ دستور ایک جسم وجاں کے سارے معاملے سمیٹ کر دفن کر دیے تھے جبکہ وقت کا دور جاری و ساری تھا ۔ احمد شاہ بیٹے کی موت کے صدمے سے کچھ دیر کے لئے دماغی توازن کھو بیٹھے ۔ بات بات پہ آنکھ سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ۔ دھیان کی حالت یہ کہ بات کوئی اور ہوتی ، جواب کچھ اور ملتا ۔ کئی نمازوں کی امامت قضاء کردی ۔ مگر پھر جیسے جیسے وقت گزرا، عبادت کے ذریعے ، دُرود کے ورد سے ، وظیفے کی برکت سے حالت کچھ سُدھری ۔ اللہ کے نام میں قدرت کے کرشمے چُھپے ہوئے ہیں ۔ سلسلۂ نسل ونسب تو ختم ہوا، سلسلۂ حیات کو کون روکے ۔ احمد شاہ نے اپنی ذات کی منتقلی خدا کی ذات میں کردی ۔ آہستہ آہستہ وہ موقع آیا کہ احمد شاہ چوبیس گھنٹے میں ایک بار رزق کے کچھ دانے منہ میں ڈالنے کو سر اُٹھاتے ، پھر تسبیح کے دانوں میں ، یا نماز کے استغراق میں کھو جاتے ۔

اُس طرف رضیہ سُلطانہ کے گھرانے پر قضا نے جھپٹا مارا ۔ اُس کی ماں میٹھی اللہ کو پیاری ہوگئیں ۔ پھر اُس کے باپ پہ فالج کا حملہ ہوگیا ، جس سے وہ بعد میں سنبھل تو گئے ، مگر دل اور دماغ پہ اثر زائل نہ ہوا ۔ یہ دو موتیں اور بیماری کا حملہ چند ہفتے کے اندر وقوع پذیر ہوئے ۔ رضیہ سلطانہ کی حالت کسی کے دیکھنے میں نہ آئی ، کیونکہ فیروزشاہ کی موت کے ساتھ ہی وہ ایک طرح سے رو پوش ہوگئی ۔ کرامت علی اُس کی ماں کی وفات کے موقع پر اُس کے گھر گیا، مگر رضیہ سلطانہ سے ملاقات نہ ہوسکی ۔ گھر پہ اُس کا بہنوئی عیادت کے آنے والوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا ۔ کرامت علی تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا ۔ اس طرح کرامت علی کی زندگی کا ایک بُہت بڑا دور اپنے اختتام کو پہنچا ۔

وقت حسبِ دستور گزرتا گیا ۔ کرامت علی کی شادی ہوگئی اور وہ لاہور کے ایک علاقے میں اپنی نوکری کے قریب کرائے کے مکان میں رہنے لگا ۔ اُس کے ہاں ایک بیٹا تولد ہوا جس کا نام اُس نے سلامت علی رکھا ۔ اِس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک پُر اسرار واقعے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ واقعہ ، یا اس کا سبب،

2009/08/27 12:33

کسی کے علم میں نہ آیا، محض اس کے نتائج دیکھنے میں آئے ، جو اصل واقعہ سے بھی زیادہ اسرار کے حامل تھے ۔ بہر حال ، جو کچھ دنیا کی نظروں کے سامنے پیش آیا ، اُس کا حال یوں ہے :۔

چند مہینے کے اندر کرامت علی نے نوکری سے استعفٰی دے دیا اور بیوی بچے کو لے کر گاؤں لوٹ آیا ۔ چوہدری برکت علی کو، گاؤں کے دیگر لوگوں کی مانند ، کچھ مایوسی ہوئی کہ بیٹے نے سرکاری وردی اُتار پھینکی ہے ۔ مگر اُنہیں اِس بات سے سہارا ملا کہ شاید کرامت علی اب کاشتکاری کی جانب راغب ہو جائے ۔ وہ اب عمر رسیدہ ہو چکے تھے اور کھیتی باڑی اُن کے بس کا کام نہیں رہا تھا ۔ آخری دموں پہ بھی اُنہوں نے اِس اُمید کو ہاتھ سے نہ چھوڑا کہ اُن کا بیٹا اِس کام کو جاری رکھے گا اور گھرانے کی روزی کا بوجھ اپنے کندھوں پہ اُٹھائے گا ۔ مگر کرامت علی کا وطیرہ کچھ اور ہی شکل اختیار کر چُکا تھا ۔ گاؤں کی طرف لوٹ کر کرامت علی کی زندگی جس ڈھب پہ چلنا شروع ہوئی وہ بالکل انوکھی تھی ۔

2009/08/27 12:33

باب سوئم

سلسلۂ کرامتیہ کی کہانی :۔

کرامت علی کے ساتھ قصہ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ وہ شخص جس نے دین کی طرف کبھی سرسری دھیان بھی نہ دیا تھا، گاؤں لوٹتے ہی پکا دیندار ہوگیا ۔ پنج وقتی نماز ، وظیفہ ، تہجد، ڈاڑھی بڑھالی ، شرعی لباس ، ٹخنوں سے اُوپر تہمد، پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں ، مسجد میں کُل وقتی قیام، مسئلے مسائل ، غرضیکہ دین، کرامت علی کا اوڑھنا بچھونا بن گیا ۔ چوہدری برکت علی کا دین سے بس اتنا ہی واسطہ تھا کہ وقت پہ نماز ادا کردی ، روزے رکھ لئے اور تہجد پڑھ لی ۔ اُن کے لئے گویا بیٹے کی جون ہی بدل گئی ۔ مگر کیا کرسکتے تھے، اللہ کے نام کے خلاف آواز بھی نہ اُٹھائی جا سکتی تھی ۔ نیز یہ کہ کرامت علی اب بچہ نہ تھا، خود ایک عدد بچے کا باپ تھا ۔ اگر خود کفالت سے دستبردار ہوگیا تھا تو یہ اُس کی اپنی دیکھ بھال کی بات تھی ۔ چوہدری برکت علی صبر و شکر کرکے چُپ ہورہے اور گرتے پڑتے اپنے اور بیٹے کے گھر کا رزق فراہم کرتے رہے ۔

کرامت علی کا ڈیرہ اب چوبیس گھنٹے مسجد میں تھا ۔ ہوتے ہوتے اُس نے امامت کے فرائض سنبھال لئے ۔ یہاں پر یہ ذکر غیر ضروری نہ ہوگا کہ اس دوران میں مزید ایک واقعہ پیش آچکا تھا ۔ کرامت علی کے گاؤں لوٹنے سے کچھ ہی دیر پہلے احمد شاہ کا دماغی توازن بالآخر بگڑ گیا ۔ اُس شخص کے لیے یہ بھی ایک کارنامے سے کم نہ تھی کہ اُس نے اتنی دیر تک ہاتھ پاؤں مارے اور اتنا عرصہ

2009/08/27 12:33

خدا کی یاد میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھا تھا ۔ مگر آخر کار غم کے بوجھ تلے یاد اللہ کا بند بھی ٹوٹ گیا ۔ ایک روز وہ کسی کام سے شہر کو گیا اور وہاں سے فقیری کی حالت میں واہی تباہی بکتا ہوا لوٹا ۔ وہ دِن جاتا تھا کہ احمد شاہ نے مسجد کے اندر قدم دھرنا بند کر دیا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے احمد شاہ پیش امام جس کی گاؤں بھر میں عزت تھی، ایک ایسے فقیر کی شکل میں بدل گیا جس کو نہ اوڑھنے بچھونے کی فکر نہ گھر باہر کی پرواہ ۔ سارا سارا دن گاؤں کی گلیوں اور کھیتوں میں آوارہ پھرتا ، ایسی ایسی باتیں بکتا رہتا جن کا کہ سر نہ پیر، اُلٹی سیدھی گردانیں کرتا، آنکھیں سُرخ کئے ہر آنے جانے والے کو کوستا، مارنے کو دوڑتا ، اور رات کے کسی وقت مسجد کی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ جاتا ۔ کرامت علی جو رات بھر مسجد میں ہی گزارتا ، اُسے دیکھنے کو دروازے تک آتا ، مگر کبھی اُسے اندر آنے کو نہ کہتا، بس مسجد میں آیا ہوا کھانا سیڑھیوں پر رکھ کر چپکے سے لوٹ آتا ۔ احمد شاہ کبھی کھانا کھا لیتا ، کبھی چھوڑ دیتا، اور وہیں سیڑھیوں پر لیٹ جاتا ۔ کبھی کبھی وہ پیٹ کے بل لیٹ کر مسجد کی سیڑھیوں کو چُومنے لگتا ۔ کپڑے اُس کے جسم پر تار تار ہو کر لٹک گئے ۔ اُس کی چند ایکڑ زمین بے کاشت پڑی پڑی بنجر ہونے لگی ۔ اُس کی بیوی نے شرم کے مارے گھر میں مُنہ چھپالیا ۔ اور کچھ عرصے کے بعد اسی حالت میں جہانِ فانی سے رخصت ہوگئی ۔ جب اُس کی لاش برآمد ہوئی تو اُس کی ہڈیاں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ فاقہ کشی سے مری ہے ۔ گاؤں کے لوگ احمد شاہ کو دیکھتے اور منہ پھیر لیتے ، جیسے اُس کے غم کی تاب نہ لا سکتے ہوں ۔ ہوتے ہوتے وہ فقیر جسے اپنی پہچان بھی نہ تھی ، موضع رکھوال کی خاص پہچان بن گیا ۔ ایک وہ وقت بھی آیا کہ گاؤں کے لوگوں نے احمد شاہ فقیر کی جانب توجہ دینا ہی چھوڑ دیا ، گویا وہ گاؤں کے سینے میں دفن کوئی ایسا راز ہو جس سے چشم پوشی لازمی ہے ، سوائے ایک شخص کرامت علی کے ، جو چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ باقاعدگی سے روٹی اُس کے آگے مسجد کی سیڑھیوں پر رکھ کر واپس چلا آتا ۔ اور کبھی اُسے اندر داخل ہونے کی دعوت نہ دیتا ۔

کرامت علی کے طریق میں تبدیلی پہلی مرتبہ اُس وقت آئی جب اُس نے گاؤں کے ایک بچے کو دم کیا ۔ بچے کو دے کا سخت دورہ پڑا ہوا تھا ۔ اُس کی سانس اُوپر کی اُوپر اور نیچے کی نیچے گلے میں پھنسی ہوئی تھی ، اور گاؤں کے دو حکیموں کی دواؤں اور تعویز دھاگے والے دوسرے لوگوں سے صحت کی کوئی

2009/08/27 12:34

صورت نہ نکل رہی تھی ۔ آخر ایک رات کو نا اُمیدی کی حالت میں عورت اُس نیم مُردہ بچے کو اُٹھائے مسجد کو لے آئی کہ اُس کے بچے کی رُوح پرواز کرے تو مسجد میں کرے ۔ مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے احمد شاہ فقیر نے گرج کر عورت کو گالی دی اور مارنے کو اُٹھا ۔ عورت نے روتے روتے ہاتھ باندھ لئے اور اُس سے بچتی بچاتی سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں داخل ہو گئی ۔ مسجد کے اندر عورتوں کے داخلے پر قانوناً پابندی تو نہ تھی ، مگر چونکہ عورت کی پاکی ناپاکی کا پتا چلانا مُشکل کام ہے اور اُس کا اپنا بیان مستند نہیں ہوتا، اِس لئے وہ روایتاً مسجد میں داخل نہ ہوتی تھیں اور نہ ہی نماز باجماعت میں شریک ہو سکتی تھیں ۔ اُس رات کو وہ عورت اپنی بیقراری میں سب کچھ بھول گئی ۔ اُس نے بچہ لے جا کر کرامت علی کے آگے ڈال دیا ۔ کرامت علی نے نظر اُٹھائی تو حیران رہ گیا ۔ ایک تو عورت مسجد کے اندر کھڑی تھی ، دوسرے وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہی تھی اور کرامت علی کے سامنے سجدے پر سجدہ کئے جا رہی تھی ۔ کرامت علی کے چہرے پر ہراس کے نشان نمودار ہونے لگے ۔ اُس بلبلاتی ہوئی عورت سے پیچھا چُھڑانے کے لئے اُس نے بے سوچے سمجھے اپنے سامنے پڑے ہوئے اُس حالتِ نزع والے بچے پر لمبی سی پھونک ماردی اور اُس کی طرف پُشت کر کے بیٹھ گیا ۔ عورت نے گڑگڑانا بند نہ کیا، بلکہ پہلو سے ہو کر دوبارہ کرامت علی کے سامنے آگئی اور اُس کے پاؤں کے آگے اپنا سر ٹیک دیا ۔ کرامت علی نے اُسے سجدے سے اُٹھانے کی کوشش کی ، مگر عورت کے سر کو ہلا نہ سکا ۔ پھر اُسے جو غضب آیا تو اُس نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا کر ایک دو ہتڑ اتنے زور سے مسجد کے فرش پر مارا کہ زمین لرز گئی ۔ عورت کسی کل کی مانند سیدھی اُٹھ کر بیٹھ گئی ، اور ساتھ ہی گویا بچے کے گلے میں پھنسی ہوئی گانٹھ کھل گئی ۔ بچہ پاؤں اور پاؤں کے زور پہ اُٹھا اور کھڑا ہو گیا ۔ پھر اُس نے منہ کھولا اور پورے زور سے چِلّا چِلّا کر رونے لگا ۔ عورت نے بچے کی آواز نکلتی سُنی تو جھپٹا مار کے اسے گود میں اُٹھایا اور ہنستی اور روتی ہوئی ، کرامت علی کو دعائیں دیتی ہوئی مسجد سے نکل گئی ۔ خُدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بچے کو اس کے بعد ایک عرصے تک سانس کا دورہ نہ پڑا ۔ مگر اتنی دیر انتظار کرنے کی فرصت کسے تھی؟ اُسی روز کرامت علی کے دم کا چرچا گاؤں بھر میں پھیل گیا ۔

2009/08/27 12:34

اب کیا تھا۔ خلقت کا تانتا بندھ گیا۔ عورتیں بچوں کو، بوڑھوں کو، بیماروں کو جن بھوت کے سائے والوں کو، بے انتہا بھاری بدن والوں اور سوکھے کے مریضوں کو، حادثے کے شکار لوگوں اور اُن کو جن کی ہڈیاں ٹوٹ کر ٹیڑھی میڑھی جُڑی تھیں، پیدائشی ناقص دماغ والوں کو اور سیدھے سادے بیوقوفوں کو غرضیکہ ہر قسم کی علت رکھنے والے لوگوں کو لئے چلی آنے لگیں۔ یہاں تک کہ کرامت علی کے پاس یادِ خُدا کا وقت کم ہوتے ہوتے صفر کے برابر رہ گیا۔ سارا وقت اب اُس کا ان لوگوں کو دم کرنے میں صَرف ہوتا۔ ان لوگوں کو روکنے کے لئے اُس نے کئی حیلے بہانے نکالنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر جہاں پہلے وہ کوئی آیت وغیرہ پڑھ کر دم کرتا تھا، اب بغیر ہونٹ ہلائے یا کچھ پڑھے پھونکوں پر پھونکیں لگانے لگا، اِس اُمید میں کہ یا تو دم ناکام ہو جائے گا، یا پھر لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ پھونک دم پڑھنے کے بغیر لگائی جارہی ہے، لہٰذا اُن کا ایمان اُٹھ جائے گا اور وہ آنے سے باز رہیں گے۔ پھر اُس نے لوگوں سے درشتی کے ساتھ پیش آنا شروع کر دیا۔ مگر ان لوگوں کی آمد نہ رُکی۔ اُس نے نمازیں ضائع کرنی شروع کر دیں۔ نماز کے وقت وہ جماعت سے الگ ہو کر سب لوگوں کے سامنے باہر مسجد کی سیڑھیوں پہ (کبھی کبھی احمد شاہ فقیر کی معیت میں) جا بیٹھتا جبکہ اندر نماز کسی کی امامت میں جاری رہتی۔ لوگوں کی موجودگی میں اُس نے تسبیح پھیرنی بند کر دی تھی اور منہ بند کئے، سر اُوپر اُٹھائے چُپ بیٹھا رہتا تھا۔ یہ سب حربے اُس نے ایک کے بعد ایک آزما کر دیکھ لئے تھے، مگر ان میں سے کوئی ایک بھی کامیاب نہ ہوا۔ خدا کی قدرت ایسی کہ تقریباً ایک تہائی سے زیادہ لوگوں پر دم کا اثر مُثبت پڑنے لگا اور ہر قسم کے عارضے کی برکت سے رفع ہونے لگے۔ غرض مند جوق در جوق آتے اور جاتے رہے۔ فیض حاصل کرنے والوں کا میلہ لگا رہا۔

اپنے گاؤں سے باہر 'سائیں' کرامت علی کی شہرت پہلے پہل لنگروں کے لنگر سے چلی۔ اِس کا قصہ یُوں ہوا کہ فیض یافتگان کے ہجوم کے ساتھ ساتھ مسجد میں کھانے کا شکرانہ لے کر آنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ گاؤں کے فقیر شِکم پُری کے لئے آنے لگے۔ پھر دوسرے غریب لوگوں کے اپنے اپنے کٹورے تھالے کھانے کا حصّہ حاصل کرنے کو آنا شروع ہوئے۔ ہوتے ہوتے

2009/08/27 12:34

کھانے کی مقدار اس حد کو پہنچی کہ گاؤں کے حاجت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد کھانا فالتو بچ رہتا، جو کرامت علی آوارہ کتوں، بلیوں اور ادھر اُدھر کے مویشیوں کو ڈال دیتا۔ تب گاؤں کی حدود کے باہر اس بات کی خبر پھیلی کہ رکھوال کے سائیں کرامت علی کی مسجد میں لنگر چلا ہے۔ چنانچہ آس پاس کے دیہات سے فقیر فقراء لنگر سے پیٹ بھرنے کو آنے لگے۔ بھوک مٹانے کے لئے آنے والوں کے ساتھ ساتھ اُن دیہات کے باحیثیت لوگوں میں بھی خبر عام ہوگئی کہ رکھوال کے سائیں کرامت علی اسم با مسمّٰے کرامت ہیں۔ نتیجے کے طور پر وہاں سے آنے والوں کا سفر بھی جاری ہوا۔ اسطرح باہر کے علاقے میں شہرت پھیل جانے سے کرامت علی کی اپنے موضع میں بھی عزت دوبالا ہوگئی۔ چنانچہ گاؤں کے تھوڑا بہت پڑھے لکھے اور مخیر زمیندار لوگ، جو کرامت علی کو گھر کا لونڈا سمجھ کر خاطر میں نہ لاتے تھے، اب معتقد ہونا شروع ہوگئے۔

گو یہ لوگ پہلے پہل دم کروانے اور حاضری دینے کی حد تک نہ بڑھے، مگر نذر و نیاز کے معاملے میں بخل سے کام نہ لیا۔ روزانہ لنگر میں کھانا بھجوانے کے علاوہ جب کٹائیوں کے موقعہ پر انہوں نے جنس کی بوریاں بھیجنی شروع کر دیں تو معاملہ مسجد کی حدود سے باہر جا نکلا۔ اب ضرورت یہ پیش آئی کہ وہاں سے نکل کر ڈیرہ کسی اور جگہ پہ ڈالا جائے۔ چوہدری برکت علی نے جب یہ صورت دیکھی تو اپنی ذاتی زمین میں چار کنال کے رقبے کے گرد کچی دیوار کھڑی کر دی اور بیچ میں تین کمرے کھڑے کر دیئے۔ جب یہ ڈیرہ تیار ہوگیا تو کرامت علی اپنے پیروکاروں سمیت مسجد سے اٹھ کر وہاں جا بیٹھا۔ یوں بھی مسجد میں اب اُس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ نماز چھٹ گئی تھی، ہاتھ میں صرف تسبیح رہ گئی تھی، جس کے دانوں کو وہ محض عادتاً گنتا رہتا تھا، مقصد کچھ بھی نہ رہ گیا تھا۔ زبان سے اسم خدا کا ورد غائب ہوگیا تھا اور اس کی جگہ دم کی بے حساب [illegible] نے لے لی تھی۔ اپنا الگ ڈیرہ اب اُس کے مقصد کے لئے مناسب [illegible] تھا۔

ڈیرے میں منتقل ہوتے ہی اُس کا نام سائیں کرامت [illegible] بدل کر سائیں کرامت علی شاہ ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جیسے ہی اُس [illegible] وقار میں قدرے اضافہ ہوا، اُس نے سائیں کا لقب ترک کر دیا، اور ساتھ [illegible] سختی سے ہدایت جاری کر دی کہ اسے استعمال نہ کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے [illegible] کی جگہ پر

2009/08/27 19:44

سیّد لگانے کی سعی کی ، مگر کرامت علی شاہ نے کہہ دیا کہ وہ چوہان ہے ، آلِ رسول کیسے بن جائے ؟ لفظ شاہ اُس نے ایک اعزازی لقب کے طور پر نام کے ساتھ لگانے کی اجازت دے دے تھی ، لہٰذا یہ اضافت قائم رہی ۔ اپنے ذاتی ڈیرے کے قیام کے ساتھ ہی اُس کے عوامل میں وُسعت آنے لگی ۔ اب محض دم پھونک کی بجائے تعویز دھاگے کا استعمال بھی جاری ہوگیا ۔ جوڑوں کے دردوں کے لئے کلائی اور ٹخنے پر باندھنے کو دھاگا ، سِل اور دق کے مرض کے لئے چاندی کا کڑا ، نظرِ بد اور جن کے سائے سے نکلنے کے واسطے تعویز ، بد رُوح سے بچاؤ کی خاطر عمل ۔ پھر فال کا نکالنا ، مقدمے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے دُعا معہ تعویز ، محبوب کو زیر کرنے کے لئے وِرد ۔ اس کے بعد مثبت کی بجائے منفی حصُولِ خاطر ، یعنی دُشمن کو تباہ کرنے کے لئے گنڈے وغیرہ کی تجویز ۔ ان چیزوں کے ساتھ نذر نیاز کی قیمت میں اضافہ ناگزیر تھا ۔ چُنانچہ جیسے لنگر کے بعد جِنس کی بوریاں وارد ہوئی تھیں ، اب اُن کے پیچھے کپڑے لتّے ، ریشم کی چادریں ، برتن ، گھریلو سامان یعنی میزیں کُرسیاں ، رنگین پلنگ ، نِواڑ ، کاؤ تکیے ، دریاں قالین ، اور آخر میں پیسوں کی رقمیں آنے لگیں ۔ کسی نے بڑے کمرے کی چھت کے اُوپر ایک بانس گاڑ کر اُس کے سِرے پر سبز رنگ کا جھنڈا باندھ دیا ، جو اس مقام کے تقدس کا اشارہ بن گیا اِس طرح کرامت علی شاہ کے ڈیرے کا قیام عمل میں آیا ۔

کچھ عرصہ اسی طرح گُذر جانے کے بعد ایک واقعہ پیش آیا جو اس مقام طریقت کی جڑیں ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگانے کا موجب بنا ۔ دس کوس کے فاصلے پر موضع کچا کھوہ واقع تھا ۔ کچا کھوہ کو بڑا قصبہ نہ تھا ، مگر ایک تو لب سڑک ، اور دوسرے چوہان برادری کا اِس سارے علاقے میں مرکز تھا ۔ اس کا ایک گھرانہ جس کا آڑھت کا کاروبار دارالخلافہ جیسے بڑے شہروں تک پھیلا ہوا تھا ، اس موضع کی تین چوتھائی زمین کے رقبے کا مالک تھا ۔ رکھوال اور کرامت علی شاہ کی قسمت کا ادل بدل اُس روز ہوا جب کچے کھوہ کے چوہانوں کے بھائی ، اپنی ہی برادری کے ایک فرد کی شہرت سُن کر رکھوال آیا اور کرامت علی شاہ کے رُوبرُو سوالی ہوا ۔ رحمت علی چوہان کا سوال کرامت علی شاہ کے لئے نیا سوال نہ تھا ، مگر ایسا سوال تھا جس پہ ہاتھ ڈالنے کی کرامت علی شاہ نے کبھی ہمت نہ کی تھی ۔ یہ سوال اولاد اور بے اولادی کا تھا ۔ اس سوال پہ اس نے

2009/08/27 19:45

کوئی دم پھونک ، تعویز یا عمل نہ کیا تھا ۔ اس سے کنّی کترانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں کامیابی کے امکانات بہت کم تھے ۔ دوسری یہ کہ دین سے دُور ہونے کے باوجود کرامت علی شاہ کے دِل میں خوفِ خُدا کی رمق باقی تھی ، اور اُس کے خیال میں پیدائش اور موت دو چیزیں ایسی تھیں جو صِرف اللہ کے ہاتھ میں تھیں ۔ اُس کے دل میں وہم تھا کہ اگر اس نے ان دو معاملوں میں دخل اندازی کی تو اس کے ہاتھ سے باقی چیزوں کی قدرت بھی چِھن جائے گی ۔ رحمت علی چوہان کے آگے اِسی وجہ سے اس نے انکار پہ انکار کیا ۔ مگر رحمت علی ارادے کا بہت پکّا نکلا ۔ وہ دنیا بھر میں گھوم پِھر کے ، ڈاکٹروں سے لے کر بزرگوں تک کی حاضری دے کر مدد مانگ چکا تھا ۔ اب ، اس کے الفاظ میں ، یہ اُس کی آخری درگاہ تھی ، جہاں سے وہ نااُمید نہیں لوٹنا چاہتا تھا ۔ رحمت علی چار بھائیوں میں سب سے بڑا تھا ۔ اس نے بتایا کہ چوہانوں کے کاروبار کو اُسی نے شروع کیا تھا اور اسے مُلک گیر بنانے میں بڑا ہاتھ اسی کا تھا ، اور بد قسمتی دیکھئے کہ چاروں میں وہی ایک تھا جو اولاد سے محروم رہ گیا تھا ۔ رحمت علی نے کرامت علی شاہ کو آخر میں اپنی برادری کا واسطہ دیا اور کہا کہ وہ اپنے دل کی مُراد لئے بغیر وہاں سے نہیں ٹلے گا ۔ کرامت علی شاہ کی رحمت علی کے آگے پیش نہ گئی ۔ بادِلِ نخواستہ اُس نے مدد کا وعدہ کر لیا ، گو وعدہ اس نے صِرف پیشگوئی کا کیا ۔ اس نے رحمت علی سے کہا کہ وہ نہ تعویز دے گا نہ کوئی عمل کرے گا ، صرف استخارہ کر کے اسے بتا دے گا کہ اولاد کی نعمت اس کے نصیب میں تھی یا نہیں ۔ رحمت علی نے اس روز وہیں پہ ڈیرہ کیا ، اور کرامت علی شاہ نے اسی رات کو استخارے کا ارادہ باندھ لیا ۔ رات کے دوران اُسے اشارہ ملا کہ ایک نومولُود بچہ ہے جو چلّا چلّا کر رو رہا ہے ۔ صُبح سویرے اٹھ کر اس نے رحمت علی کو یہ خوشنودی دی ۔ رحمت علی کے چہرے پہ بہار لوٹ آئی ۔ وہ نوٹوں کی [illegible] چڑھا کر خوشی سے اچھلتا ہوا گھر واپس لوٹا ۔ تین ہی ماہ گذرے تھے کہ [illegible] علی نے آکر کرامت علی شاہ کو اطلاع دی کہ اس کی بیوی کو حمل ٹھہر گیا ہے ۔ رحمت علی مٹھائیوں اور پھلوں کے ٹوکروں ، ریشمی بستروں اور نوٹوں کی [illegible] سے لدا مزید ایک سوالی بن کر آیا تھا ۔ اب کے اس کا سوال تھا کہ دعا کی جائے اولادِ نرینہ ملے ۔ کرامت علی شاہ نے دعا کی ۔ رحمت علی کی پچیس سال کی [illegible] ہوئی ٹہنی ہری ہوئی تھی ، اس کے پَیر زمین پہ نہ ٹِکتے تھے ۔ اس کی واپسی [illegible] تھی

2009/08/27 19:45

کہ یہ خبر آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی کہ اولاد کی دین کرامت علی شاہ کے ہاتھ میں تھی ۔ پھر کیا تھا ، بے اولادوں کا تانتا بندھ گیا ۔ کرامت علی شاہ نے بہت روکا ، بہت روکا ، مگر آخر کب تک ۔ بے اولاد عورتوں کے رونے دھونے ، ان کی آہ و فریاد ، منت سماجت ، اور نذر و نیاز کی فراوانی کے سامنے مجبور ہو کر کرامت علی شاہ نے اِستخارے کرنے شروع کر دیئے ۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ ، کہ اِستخارے کے اندر جس کسی کے بارے میں ولادت کا اشارہ ملتا وہ اولاد کی دولت سے مالامال ہوتا ۔ اشارہ کبھی جھوٹ نہ نکلتا ۔ یہ دوسری بات تھی کہ دس میں سے دو ایک کو ہی اولاد کا اشارہ ملتا ، باقیوں کو انکار کی مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ۔ مگر اِس سے کرامت علی شاہ کی مشہوری اور حاجت مندوں کی آمد میں کوئی کمی نہ آئی ، بلکہ متواتر اضافہ ہوتا چلا گیا ۔ اب دن کیا اور رات کیا ، بانجھ عورتیں اور بے پھل مرد کرامت علی شاہ کے ڈیرے کا احاطہ کئے رہتے ۔ رحمت علی کی خبر کے ٹھیک آٹھ ماہ بعد اُس کے ہاں بیٹا تولد ہوا ۔ جس روز رحمت علی کی آمد رکھوال میں ہوئی ، اُس روز کا سماں دیکھنے کے لائق تھا ۔

آگے آگے ڈھول والے تھاپ دیتے ہوئے آرہے تھے اور پیچھے چاروں بھائی گھوڑوں پہ سوار گلے میں ایک ایک ہار ڈالے ، جلوس کی راہنمائی کر رہے تھے ۔ ساتھ ساتھ اُن کے نوکر بیسیوں ہار چاندی کی طشتری میں ڈھیر کئے ، طشتری کو بیل گاڑی میں رکھے لا رہے تھے ۔ پیچھے کچے کھوہ کی ساری چوہان برادری ، کچھ گھوڑا اور گدھا گاڑیوں پہ کچھ پیدل چلے آرہے تھے ۔ صرف ایک بات حسبِ معمول نہ تھی ۔ کوئی ڈالی ، کوئی نذر نیاز کے تھال ، کوئی نوٹوں کے ہار ، کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا ۔ ہاں ایک غیر معمولی شے نظر آرہی تھی ۔ یہ ایک ڈولی تھی جو بیل گاڑی پہ باروں کی طشتری کے پاس رکھی تھی ۔ جب یہ جلوس کرامت علی کے ڈیرے میں داخل ہوا تو سارا گاؤں دیکھنے کو باہر نکل آیا ۔ رحمت علی طشتری سے ہار ایک ایک کر کے اُٹھائے اور کرامت علی شاہ کے گلے میں پہناتے گئے ۔ پھر باروں سے لدے پھندے کرامت علی کو چاروں بھائیوں نے اُٹھا کر ڈولی میں بٹھلایا ۔ کرامت علی شاہ ایسا حیران پریشان کہ مزاحمت کرنے کی بھی توفیق نہ ہوئی ، آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھتا رہا ۔ جب وہ ڈولی میں بیٹھ چکا تو چوہانوں نے ڈولی کا رُخ شہر کی جانب موڑ دیا ۔ پھر جو وہ ڈھولوں کی دھمک پر ،

2009/08/27 19:45

بیچ بیچ میں 'پیر کرامت علی شاہ ، زندہ باد' کے نعرے لگاتے ، وہاں سے چلے تو سیدھا ضلع کچہری میں جا کر دم لیا ۔ وہاں وکیل ، قانون گو ، پٹواری ، عرضی نویس ، پہلے سے کاغذات مکمل کئے کھڑے تھے ۔ اُسی وقت تحصیلدار مجسٹریٹ درجہ دوئم کی عدالت میں حاضر ہوئے ، گواہان کو پیش کیا ، اور چوہانوں کی ملکیت سے دو مُربع زرعی اراضی پیر کرامت علی شاہ کے نام لگا دی ۔ جب رجسٹری ہو رہی تھی تو کرامت علی شاہ نے ، جس کے نام کے ساتھ اُسی روز مجمعے نے پیر کا لقب لگا دیا تھا ، تھوڑی بہت مزاحمت کی کوشش کی ، نہ نہ کیا ، مگر رحمت علی اور اُس کے بھائی ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے ، بولے 'شاہ جی ، یہ ہمارا آپ کا معاملہ نہیں ، ہماری قوم کا معاملہ ہے ۔ ہمارے پاس اِس وقت پیسہ بے انت ، زمین کا گھیر بھی بے حساب ، مگر چوہان قوم میں نہ کوئی وزیر نہ فقیر ، پھر کیا فائدہ ؟ نہ اثر نہ رسُوخ ۔ آپ کا نام بیس گاؤں میں سُنائی دیتا ہے ۔ قوم کی مدد سے بیس ہزار میں گُونجے گا ۔ کچا کھوہ آپ کی قوم کا گڑھ ہے ۔ آپ کا مقام رکھوال میں نہیں ، کچے کھوہ میں ہے ۔ اب یہ زمین آپ کی ہے ، آپ چاہیں تو اِس پہ مقام کریں ، چاہیں تو اُٹھا کر کِسی کو دے دیں' ۔

کرامت علی شاہ کے پاس کوئی چارہ نہ رہا ۔ اُس نے اپنے ایک پیروکار کو اشارہ کیا ، جِس نے رجسٹری لے کر اپنے پاس رکھ لی ۔ پھر ڈولی گاؤں کو چلی ۔ گاؤں واپس پہنچ کر پیر کرامت علی شاہ اِسی تذبذب میں رہا کہ اب کیا کیا جائے ۔ اِتنا بڑا چڑھاوا آج تک اُسے نہیں چڑھا تھا ۔ دوسری طرف رکھوال اُس کے باپ دادا کا گاؤں اور اُس کی طریقت کے آغاز کا اصل مقام تھا ، آسانی سے چھوڑا نہیں جا سکتا تھا ۔ رحمت علی اور اُس کے بھائی ہر روز رکھوال آتے اور گذارش دُہراتے ، کہتے کہ ایک اُنگلی کے اشارے کا انتظار ہے ، وہ دنوں میں کچے کھوہ کے اندر ڈیرہ کھڑا کر دیں گے ۔ آخر کئی روز کی سوچ بچار ، صلاح مشورے ، نفع نقصان اور اونچ نیچ کا جائزہ لینے کے بعد پیر کرامت نے اپنی برادری کی چابلت اور زمین کی کشش کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ۔

اشارے کی دیر تھی کہ رحمت علی نے اپنے قول کے مطابق کام شروع کر دیا ۔ لگتی ہوئی دو ایکڑ زمین کا احاطہ کر کے ڈیرے کی عمارتیں کھڑی کر دیں ۔ اب پیر کرامت علی شاہ کے کُوچ کی تیاریاں شروع ہوئیں ۔ اِن چند سالوں میں اِتنا

2009/08/27 19:46

سازوسامان اِکٹھا ہو چُکا تھا کہ رکھوال کے ڈیرے کا دالان اور دو کمرے ، اور چوہدری برکت علی کا گھر سب چھتوں تک پُر تھے ۔ اِس سامان کو بَیل گاڑیوں پر لاد کر بھیجنا شروع کیا تو کئی دِن لگ گئے ۔ بد قسمتی سے اسی دَوران میں چوہدری برکت علی بیمار پڑے اور تین روز کے اندر قضائے اِلٰہی سے وفات پا گئے ۔ سارا کام رُک گیا ۔ اُن کے جنازے پر سینکڑوں لوگ شامل ہوئے ۔ پیر کرامت علی شاہ نے چالیس روز تک دم پھونک ، تعویز ، عمل اور استخارے سے ہاتھ کھینچ لیا اور ایسے حُجرے میں بند رہا ، جبکہ باہر ہر روز ختم قرآن کی دیگیں چڑھتی رہیں ۔ چالیس روز کے بعد کُوچ دوبارہ شروع ہوا ۔

جب پیر کرامت علی شاہ کچے کُھوہ میں پہنچا تو اِس کے ہمراہ کئی سو پیروکار جلوس کی شکل میں اُسے رخصت کرنے کی خاطر گئے ۔ اُس کی بیوی اور بچے اور دونوں ماؤں کے واسطے گاؤں میں مکان ، اور سامنے کچھ دُور پیر کا ڈیرا مکمل تیار کھڑا تھا ۔ ڈیرے میں حجرہ خاص کے دو کمروں کے علاوہ کچے اور پکے کئی کمرے تھے ۔ حُجرے کی چھت پر بہت موٹا اور مضبوط بانس گڑا تھا جس پہ بڑا سا سبز جھنڈا لہرا رہا تھا ۔ جھنڈے پر سنہری الفاظ میں کلمۂ طیبہ لکھا تھا ۔ احاطے کی دیوار کے بیچ کھلا سا گیٹ نصب تھا جس کی چوڑائی میں سے دو بیل گاڑیاں گُزرتی تھیں ۔ گیٹ کے اُوپر بورڈ لٹک رہا تھا جس کے اُوپر لکھا تھا : "ڈیرہ پیر کرامت علی شاہ ، موضع کچا کھوہ ، تحصیل لاہور ۔ ضلع پنجاب ۔" دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے رکھوال کا ڈیرہ وہاں سے اُٹھوا کر ، گویا جادو تعویز کے اثر سے بڑے سائیز میں پھیلا کر کچے کُھوہ میں لا کر رکھ دیا گیا ہو ۔

زمینی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ انسانی سلسلے کا پھیلاؤ بھی ناگزیر تھا ۔ چنانچہ سب سے اوّل نام کے ساتھ پیر کا اضافہ ہوا اور گیٹ کے بورڈ پر لمبی سی عبارت تحریر ہوئی ۔ اُس کے بعد پہلا کام جو ہوا اُس سے پیر کرامت علی شاہ کی بیعت کا سلسلہ جاری ہوا ۔ اِس کا عمومی انداز تو ایسا قائم ہے کہ کوئی بزرگ پہلے جا کر اپنا ایک مُرشد پکڑتا ہے ، پھر کچھ عرصے کے بعد وہ مُرشد اُسے اپنے امتحان سے گزارنے کے بعد اپنی بیعت کا سلسلہ قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے ۔ مگر پیر کرامت علی شاہ [illegible] بدل چکا تھا ۔ اب اُس کا انداز ایسا تھا کہ اُس نے ان لوازمات کو خاطر میں لانا گوارا نہ کیا ۔ چنانچہ جب پہلی بار رحمت

2009/08/27 19:46

علی اور اُس کے بھائیوں نے اس بات کا ذکر کیا کہ کسی مُرشد سے اپنی بیعت کے اجراء کی اجازت حاصل کر لینی چاہئیے ، تو پیر کرامت علی شاہ نے یہ کہہ کر کہا "مُرید بھی یہاں اور مُرشد بھی یہاں اللہ کی راہوں پر کوئی رکاوٹ نہیں ۔" بلا جھجک اپنا الماس کی انگوٹھی والا ہاتھ آگے بڑھا دیا ۔ چوہان برادران نے جب یہ جلال دیکھا تو بلا مُجت سر جُھکا کر ہاتھ کو چُوما اور بیعت کر لی ۔ اُس کے بعد چوہان برادری کے سب افراد نے باری باری بیعت کی ۔ یہاں سے پیر کرامت علی شاہ کی صحیح طریقیت کا آغاز ہوا ، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اب خلقِ خدا اپنی عرضیں اور منتیں لے کر ہی نہ آتے بلکہ بے حاجت بھی ، محض آخرت میں اپنی بخشش کی خاطر پیر کا ہاتھ تھامنے کی غرض سے آنے لگے ۔ بیعت کے ساتھ ہی پیر کرامت علی کے اپنے ارادی عمل کی ابتدا بھی ہوئی ۔ اب تک پیر کرامت علی کے سازے سلسلے کے قیام میں جو کچھ ہوا اُس کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ اُس میں پیر کرامت علی شاہ کے اپنے ہاتھ کا قطعی دخل نہ تھا ۔ جو بھی رُونما ہوا وہ قدرت کی جانب سے ، اتفاق کی رُو سے ، خلقِ خدا کے ہاتھوں ، یا حالات کی بُنت و ریخت کے تحت عمل میں آیا ۔ اب بیعت کے ساتھ پہلی بار پیر کرامت علی شاہ نے اپنے سلسلے کو بڑھانے کی خاطر ایک قدم اُٹھایا ۔ اُس نے گیٹ کے بورڈ کو اُتروایا ، اُس کی عبارت مٹوائی اور اُس کی جگہ پر نئی عبارت تحریر کروائی : "ڈیرہ پیر کرامت علی شاہ ، سلسلۂ کرامتیہ ، موضع کچا کھوہ ۔ ضلع لاہور ۔" ۔

کچے کھوہ میں آمد کے بعد پیر کرامت علی کے حلقۂ ارادت میں دن دُونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی ۔ اب اُس نے پھونک ، دم ، تعویز ، دھاگے ، اور عمل کے علاوہ مُستقل و متواتر اولاد کی خاطر استخارے کرنے شروع کر دیئے ۔ نیز یہ کہ استخارے کے عمل سے ناکامی کی شرط کا ذکر ہٹا دیا ۔ مقصود اِس سے یہ تاثر تھا کہ اِس عمل کی کامیابی کے امکان بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ پیر صاحب کے دوسرے عوامل کے ۔ اِس سے فی الحقیقت تو کامیابی کے مواقع میں اضافہ نہ ہوا ، مگر یہ اثر ضرور ہوا کہ پیر کرامت علی کی شہرت دیہاتوں سے نکل کر شہروں ، اور شہروں سے بڑے شہروں ۔ حتّٰی کہ صُوبے کے ایک بڑے حصّے تک پھیل گئی ۔ دُور دُور کے شہروں سے لوگ ، خاص طور پر عورتیں ، پڑھی لکھی اور فیشن ایبل عورتیں [illegible] کر آنے لگیں ۔ عورتیں رات بھر

2009/08/27 19:47

ڈیرے پہ قیام کرتیں ، استخارے کا عمل کرواتیں ، پیسے اور زیورات کا چڑھاوا کرتیں ، اور اگلے روز دل کی تمنا پوری ہونے پر واپس لوٹ جاتیں ۔ ان لوگوں کے دلوں میں پیر صاحب پر یقین کامل ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ پیر صاحب ایسے تھے جو اُن سے اُنہی کے لب و لہجے میں بات چیت کرنے کے اہل تھے ۔ اِن لوگوں نے پہلے کسی دیہات میں بیٹھا ہوا کوئی ایسا پیر نہ دیکھا تھا جو انگریزی اور اُردو میں شُستہ گفتگو کرتا ، مُلک کے سیاسی اور مجلسی حالات پر نہایت شگفتہ مگر چبھتے تُلے اور مرعوب کن لہجے میں تبادلۂ خیال کرتا ، انگریزی اور اُردو کے اخبار پڑھتا اور غیر ممالک تک کے حالات کے حوالے دیتا تھا ۔ اس کے بعد جب وہ استغراق میں جاتا تو اُن سے آگے کسی اور سطح پر نکل جاتا ۔ یہ ایک ایسا پیر تھا جس کی مختلف تہوں کا اسرار اُنہیں مرعوب ہی نہیں ، مکمل طور پہ قائل بھی کر لیتا تھا ۔

اب پیر کرامت علی شاہ کی زندگی میں ایک اور مقام آیا ۔ آج تک اُس کا سلسلہ کمال آرام اور صُلح جُوئی کے ساتھ ترقی کرتا آیا تھا ، جیسے کہ اُس کے ہاتھ میں ہی قدرت نہیں بلکہ اُس کے سر پہ بھی خدا کے ہاتھ کا سایہ ہو ۔ اب پہلی بار اُسے بدامنی کا سامنا کرنا پڑا ۔ ہوا یوں کہ بیس کوس کے فاصلے پر واقع موضع پکّا کوٹھا تھا جہاں کے مشہور پیر سید جسامت علی شاہ ، جو بذاتِ خود مشہورِ عالم پیر چومڑہ شریف والوں کی گدی کے حلقۂ ارادت میں سے تھے ، کچّے کھوہ والے پیر کی مشہوری کی یہ صورت دیکھ کر اپنے حلقے کی حفاظت کی خاطر حرکت میں آگئے ۔ اُنہوں نے یہ شوشہ اُٹھایا کہ پیر کرامت علی شاہ بے مُرشد ہے بزعمِ خود سلسلہ قائم کر کے روایت سے مُنحرف اور خلافِ شرع حرکت کا مُرتکب ہوا ہے ۔ اِس پراپیگنڈا کی اکا دُکا خبریں کچّے کھوہ تک پہنچتی رہیں ، لیکن کسی نے اِس پر دھیان نہ دیا ۔ آخر ایک روز معاملہ حد سے گُذر گیا ۔ صُبح سویرے پیر کرامت علی شاہ کے احاطے کے عین درمیان میں ایک مُردہ کُتے کی پڑی ہوئی مِلی ۔ یہ احاطہ ، جِس کے اندر کُتے جیسے نجس جانور کو زندہ حالت قدم دھرنے کی اجازت نہ تھی ، اب ایک مُردہ کُتے کی لاش سے بے حُرمت کر دیا گیا تھا ۔ اِس شرارت سے پیر کرامت علی شاہ کے مُریدوں اور ساری چوہان برادری کا خون اُبل پڑا ۔ مُخبروں نے اطلاع دی کہ اس شرارت کی جڑ پکّے کوٹھے سے

2009/08/27 19:47

پھوٹی تھی ۔ چنانچہ سینکڑوں مُرید اور چوہانوں کے گھرانوں کے گھرانے کیل کانٹے سے لیس ہو کر پیر کے احاطے میں آ جمع ہوئے اور انتقام کا مطالبہ کرنے لگے ۔ پیر کرامت علی نے اُنہیں ایک رات رُکنے کا حکم دیا ۔ اُس رات کو پیر کرامت علی نے اِستخارہ کیا اور فتح کی خوشنودی پائی ۔ صُبح سویرے اُس نے اپنے ہجوم کو اشارہ دے دیا کہ جاؤ ، دُشمن کو زیر کرو ۔ ادھر سے گھوڑ سوار کے ہاتھ پیغام بھیجا گیا کہ کچے کھوہ والے بے حُرمتی کا بدلہ چکانے پکے کوٹھے آ رہے ہیں ، حق پر ہو تو نِکل کر مقابلہ کرو ۔ اُدھر سے جسامت علی شاہ کا لشکر بھی نِکل آیا ۔ گرمیوں کی کڑکتی دوپہر میں پکے کوٹھے سے ایک کوس باہر دونوں لشکر دُھول کی تھاپ اور برچھیوں کی چمکاہٹ میں ، دھُول کے بادل اُڑاتے اور جذبۂ ایمان سے سرشار للکارتے ہوئے ایک دوسرے کے مقابل آ کھڑے ہوئے ۔ دیکھنے والوں کا کہنا تھا کہ قیامت کا رَن پڑے گا اور بیسیوں جانیں ضائع ہوں گی ۔ مگر خُدا کا کرنا کیا ہوا کہ اُدھر پولیس کو بھی عین وقت پہ خبر ہوگئی اور علاقے کا ڈی ۔ ایس ۔ پی ۔ گارڈ لے کر موقعہ پر دونوں فریقوں کے بیچ آ پہنچا ۔ اُس نے اطراف کے کچھ لوگوں کو گرفتار کر لیا ، اور باقیوں کو گرفتاری کی دھمکیاں دے دِلا کر واپس بھیج دیا ۔ اِس طرح یہ معاملہ خون خرابے کے بغیر ختم ہوگیا ۔

آخر طاقت کے اِس مظاہرے کے بعد صُلح صفائی کی کوششیں ہونے لگیں ۔ عِلاقے کا بڑا زمیندار شیر بہادر جولیانہ آف مکھن چک ، جو اِس قومی حلقے سے ایم ۔ این ۔ اے بھی تھا ، بیچ میں آ کر ثالث مُقرر ہوا ۔ اِدھر سے رحمت علی ، اُس کا ایک بھائی ، اور پیر کرامت علی کے دو بڑے مُرید ، اور پیر جسامت علی کی جانب سے اُس کا ایک بھائی اور تین مصاحب لاہور میں شیر بہادر جولیانہ کی کوٹھی پر اکٹھے ہوئے ۔ کچھ لے دے کے بعد وہاں پر دونوں پیروں کے علاقوں کا بٹوارہ ہوگیا ۔ فیصلہ اِس طرح ہوا کہ زمین پر زبانی زبانی ایک حد دی گئی جس کے اِدھر کا علاقہ کچے کھوہ کا حلقۂ ارادت تسلیم ہوا ، اور اُدھر کا علاقہ پکے کوٹھے کے زیرِ اثر آیا ۔ ایک کو دوسرے کے علاقے پر بیعت چلانے اور مُرید لینے کی ممانعت کر دی گئی ، صرف منّتیں ماننے والوں اور خاص الخاص مُریدوں کو آزادی دی گئی کہ وہ اپنی غرض کے مطابق جس پیر صاحب کی ولائت میں چاہیں دل کی آرزو لے کر جا سکتے ہیں ۔ اِس فیصلے پر فریقین کا سمجھوتہ ہوا اور بالآخر

2009/08/27 19:47

معاملے کا خاتمہ بالخیر ہوا ۔

اِس کانٹے کے بیچ سے نِکل جانے کے بعد جہاں پیر کرامت علی شاہ کی حیثیت بڑی حد تک جامع اور مسلّم ہوگئی ، وہاں اُس میں دو بڑی تبدیلیاں بھی واقع ہوئیں ۔ ایک تو اُس نے اچانک اپنے تن سے سارے کپڑے علیحدہ کر دیئے اور ایک لمبی سی سفید چادر بدن کے گِرد لپیٹ لی ۔ اُس دِن کے بعد سے اُس کے جِسم پر پوشاک کے طور سِوائے اِس ایک چادر کے کبھی کِسی کپڑے کا بار نہ ہوا ۔ دِن اور رات ، گرمی اور سردی ، اندر اور باہر ، گھر اور سفر میں ، سوتے اور جاگتے اُس کے جِسم خاکی کی شرم صرف اِس سفید براق چادر سے ڈھکی ہوتی ۔ اسی چادر کا ایک پلّو اُس نے سر پہ بھی اوڑھا ہوتا ، جس کو استغراق کی حالت میں وہ آگے کھینچ کر چھوٹا سا گھونگٹ نِکال لیتا ۔ دوسری تبدیلی اُس نے اپنے ہاتھ سے یہ کی کہ گیٹ کا بورڈ اُتروایا اور لکھی ہوئی عبارت مِٹوا کر نئی عبارت لکھوائی ۔ حُجرۂ پاک حضرت پیر کرامت علی شاہ بُراقی عُرف بلبا چدر پوش بائی گدی شریف کچا کھوہ ، سلسلۂ کرامتیہ ، موضع کچا کھوہ ۔ پنجاب ۔

کرامت علی شاہ اگر اسمِ با مُسمّیٰ تھا تو اُس کا حریف پیر جسامت علی بھی اِس حساب سے کچھ کم نہ تھا ۔ وہ جِتنا اُونچا تھا اُتنا ہی چوڑا تھا اور بڑے بڑے گھروں کے دروازوں میں اٹک جاتا تھا ، بلکہ صُوبائی اسمبلی میں ، جہاں وہ علاقے کا ایم ۔ پی ۔ اے ۔ تھا ، "اسمِ مُسمّیٰ" کے لقب سے ہی مشہور تھا ۔ جسامت علی شاہ پر فتح پانے کے بعد کرامت علی شاہ کے دِل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ وہ سیاست میں داخل ہو اور پیر جسامت علی کا مقابلہ کرے ۔ ایک عرصے تک وہ اِس خواہش کو دِل ہی دل میں پالتا رہا ۔ اُسے اپنی جوانی کا زمانہ یاد آگیا ، اور اُس کے دِل میں میدان مارنے کی غالباً آخری اُمنگ اُبھری ۔ اُس نے رحمت علی اور اُس کے بھائیوں سے اس بارے میں مشورہ بھی لیا ، جنہوں نے پُورے دِل سے اُس کی ہاں میں ہاں مِلائی ۔ پھر آخری وقت پہ اُس نے اِس سلسلے میں اِستخارہ کیا ۔ اِستخارے کے دوران اُسے صرف اپنے نَو عُمر بیٹے جسامت علی کی شکل ہی نظر آتی رہی ۔ اس اشارے کے بعد کرامت علی شاہ نے اپنا ذہن بدل دیا ۔ اُسے اپنے دِل میں اِس بات کا یقین ہوگیا کہ اُس کی اپنی کچی کھوہ کی گدی کی نشوونما اور حفاظت کے لئے وقف تھی ، جبکہ سیاست کی گدی پر مقرر

2009/08/27 19:48

ہونا اُس کے بیٹے کے مقدر میں تھا ۔ اُس وقت سے اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے کی پرورش میں اپنے تمام تر تجربے کا نچوڑ شامل کر دے گا اور اُسے ایک ایسا شخص بنائے گا جو آسمانوں پہ لپک مارنے کے قابل ہو جائے گا ۔

ایک زمانہ پھر ایسا آیا کہ مُلک میں جرنیلوں کی حکومت ہوگئی ۔ جس طرح سیاست دانوں نے اسلام اور توحید کے مبارک نام پہ قوم کو یکجا رکھنے کی کوشش کی تھی ، جب جرنیل سیاست پر قابض ہوئے تو انہوں نے بھی یہ بنا بنایا حربہ مُستعار لے لیا ۔ مُلک کی مسلح افواج نے ایک ایسا پلٹا کھایا کہ اُن کی انگریزیت دیکھتے دیکھتے غائب ہوگئی ۔ جہاں وہ پہلے صرف انگریزی بولتے اور کلبوں میں پی پلا کر ناچ کرتے تھے ، اب یکایک اُنہی افسروں نے نمازیں پڑھنی اور حج و عُمرہ وغیرہ کے فریضے ادا کرنے شروع کر دیئے ، جیسے کہ چند ہی روز میں اُنہوں نے اللہ کے دِین کو دریافت کر لیا ہو ۔ صدرِ مملکت پیر پرست جرنیل تھے ۔ اُن کی دیکھا دیکھی فوج کے سینیئر افسران نے بھی مُرشد پکڑنے شروع کر دیئے ۔ اس زمانے میں کرامت علی شاہ کی مُرشدی خوب چمکی ۔ اس کی انگریزی تعلیم ، حالات عالم میں اس کی دلچسپی ، اور جدیدیت کا انداز جو کرامت علی شاہ انہی لوگوں کے لئے مخصوص رکھتا تھا ، اِس طبقے کو بھا گیا ۔ کچے کھوہ کے حلقۂ ارادت میں بھی نواح کا ایک جرنیل اور کچھ بریگیڈیئر اور کرنل شامل ہوگئے ۔ ان میں زیادہ تر ملازمت کے اُس مقام پر تھے جہاں اُن کے سامنے دو ہی راستے تھے ، یا تو ان کی ترقی کا امکان تھا ، یا ریٹائر منٹ اور گمنامی کی زندگی کا ۔ جو کچھ بھی تھا ، ان کی شمولیت سے کچے کھوہ کی گدی کو ایسی ٹھوس جامعیت اور سرپرستی حاصل ہوئی کہ اب سات پُشتوں تک اسے ہلانا کِسی کے خواب و خیال کی بات بھی نہ تھی ۔ ایک روز پیر کرامت علی اپنی جگہ سے اُٹھا اور حُجرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا ۔ وہاں سے اُس نے اپنے لمبے چوڑے احاطے ، اس کے اندر بنے ہوئے بیسیوں لوگوں اور پیپل کے دو درختوں کے سائے میں پکتی ہوئی دال کی چھ دیگوں کو دیکھا اور ایک لمبا ، اطمینان بھرا سانس لیا ۔ پھر اُس نے دیوار پہ لگے ہوئے چھوٹے سے شیشے میں ایک لمحے کو اپنے چہرے پہ نظر ڈالی ۔ اس کی ڈاڑھی میں سفید بال نِکل آئے تھے ۔ وہ حُجرے سے نِکل کر احاطے کے گیٹ پہ آ کھڑا ہوا ۔ اُسے دیکھ کر احاطے میں بیٹھا ہوا ایک ایک آدمی ادب سے کھڑا ہوا ۔

2009/08/27 19:48

کرامت علی شاہ نے نظر اُٹھا کر اُوپر دیکھا ، اَور گیٹ کے بورڈ کو اُتروانے کا حکم دیا ۔ پھر اُس نے لکھی ہوئی عبارت مِٹوا کر ، آخری بار ، ایک نئی عبارت لکھنے کا حکم دیا : 'دربار شریف حضرت پیر کرامت علی شاہ بُراقی المعروف بلیا چندر والے ، گدی سلسلۂ کرامتیہ'۔

رکھوال کا مُختصر انجام :۔

جس روز پیر کرامت علی شاہ کا کُوچ رکھوال سے ہوا اُس روز گاؤں کی ساری آبادی روتی ہوئی باہر نِکل آئی تھی ۔ کئی عورتوں نے بین کرنے شروع کر دیئے ۔ باقی کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اَور کھیتوں کی بتیوں پر کھڑی ، سر ڈھانپے ، ماتمی چہروں سے کُوچ کا نظارہ کر رہی تھیں ، جیسے گاؤں کا جنازہ اُٹھتے دیکھ رہی ہوں ۔ رکھوال کی تاریخ میں کُل تین قابلِ ذکر واقعے ہوئے تھے ۔ ایک تو گاؤں کے دو لڑکوں کا فوج اَور پولیس میں اعلےٰ عہدوں تک پہنچنے کا واقعہ تھا ۔ دوسرا پیر کرامت علی شاہ کی آمد کا تھا ۔ تیسرا واقعہ اَیسا تھا جس کا ذِکر کوئی نہ کرتا تھا ۔ یہ ایک اَیسے راز کی شکل اختیار کر گیا تھا جسے گاؤں کے لوگ بُھول جانا چاہتے تھے ۔

پیر کرامت علی کی ہجرت کے بعد رکھوال کا غرور اب دو اعلےٰ عہدے داران کے بَل پر رہ گیا تھا ۔ کچھ عرصے کے بعد بریگیڈیئر فضل محمد ترقی پا کر جرنیل کے عہدے کو پہنچ گیا ۔ سید نبی احمد کو بھی خُدا نے عزت دی اَور وہ جائنٹ سیکرٹری ہوگیا ۔ کچھ مدت کے لئے تئے سِرے سے گاؤں میں بجلی ، پکی سڑک اَور ٹیوب ویل سکیم کی آمد کی خبریں گرم ہوئیں ۔ پھر اگلے چند سال کے اندر اندر سب تہس نہس ہوگیا ۔ فضل محمد جرنیل حکومت کے خلاف ایک سازش میں ملوّث ہونے کے جُرم میں قید ہوگیا ۔ سید نبی احمد کو بدعنوانی کے الزام میں قبل از وقت ریٹائر کر دیا گیا اور وہ گاؤں کی زمین بیچ باچ کر ، اپنے بوڑھے باپ کو لے کر مُستقل طور پر لاہور کوٹھی میں مُنتقل ہوگیا ۔ پیچھے موضع رکھوال میں کچھ بھی نہ رہا ۔ مردوں کی آنکھیں گدلی پڑ گئیں ، بچوں کو مختلف بیماریوں نے آپکڑا ، اَور عورتوں کی چھاتیاں سُوکھ کر سینے سے لگ گئیں ۔ بس وہ ایک واقعہ جس پہ سب بڑے بوڑھوں نے زبان بندی کی مُہر لگا رکھی تھی ، اب پھیل کر گاؤں کے آسمان پر منڈلانے لگا ۔ موضع رکھوال کی قِسمت کچھ سالوں تو خوب چمکی ، پھر بُجھ کر راکھ ہوگئی ۔

2009/08/27 19:48

باب چہارم

سلامت علی کی واپسی :۔

جون کے دِن تھے ۔ بلا کی گرمی پڑ رہی تھی ۔ دیہات کی سڑک پر ایک موٹر دھُول اڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی ۔ گاڑی کے شیشے گہرے نیلے رنگ کے تھے جو سواریوں کو دُھوپ کی چمک سے محفوظ رکھے ہوئے تھے ۔ آگے ڈرائیور چلا رہا تھا ۔ پچھلی سیٹ پر ایک اُنیس بیس سالہ نوجوان اکیلا بیٹھا تھا ۔ یہ صاحبزادہ سلامت علی تھا ، جو بی ۔ اے ۔ کا آخری امتحان ختم کر کے گاؤں واپس لَوٹ رہا تھا ۔

سلامت علی کُھلے رنگ کا خوش شکل نوجوان تھا ، جِس کے زیب تن اَیسا لباس تھا جِس سے اُس کی حیثیت پہلی نظر میں پہچانی جا سکتی تھی ۔ بنیان کے اوپر سفید ململ کا کُرتہ ، سفید لٹھے کی شلوار ، پاؤں میں سیاہ چمڑے کی چپلی ۔ آنکھوں پہ دُھوپ کا چشمہ ، جو قیمتی دکھائی دیتا تھا مگر بڑے بڑے پھیلے ہوئے جدید طرز کے شیشوں کی بجائے گول سیاہ شیشوں والا تھا ، گویا زیبائش کی بجائے دُھوپ سے بچنے کی خاطر خریدا گیا ہو ۔ اُس کا سر کروشیئے سے بُنی ہوئی ہلکی سی گول سفید ٹوپی سے ڈھکا تھا ۔ اُس کے گالوں پہ ہلکے ہلکے نرم اور باریک بالوں کی اُگان تھی ۔ یُوں لگتا تھا کہ اِن رخساروں نے اُسترے کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی ۔ اُس کی پیشانی اور ابرُو کی بناوٹ سے ، جبڑے کی جمان اَور ہونٹوں کے خوشنود خم سے یہ تاثر واضح تھا کہ دُنیا کی بہت کم چیزیں اَیسی ہونگی جو مضبوط دل اَور ٹھنڈے دماغ والے شخص کو بلا ضرورت تحریک دلا سکیں گی اُس کی شبیہہ کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُس کی ساری شخصیت اُس کے نام ، صاحبزادہ سلامت علی شاہ ، کے عین مطابق وضع کی گئی ہو ۔

2009/08/27 19:49

یہ بات حقیقت سے دُور بھی نہ تھی ۔ پیر کرامت علی شاہ نے اپنے فرزند کی تربیت میں اپنی ہستی کا سارا زور صرف کر دیا تھا ۔ سکول اور کالج کی تعلیم دلوانے کے علاوہ وہ ماہ بہ ماہ ، سال بہ سال اُسے اپنے تجربے کا گویا نچوڑ پلاتے رہے تھے ۔ سلامت علی شاہ اُن کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ اپنے گھر کے اندر وہ گم ہی جاتے تھے ۔ بیوی سے اُن کا لین دین نہ ہونے کے برابر تھا ۔ حُجرے میں کو بچہ داخل ہو سکتا تھا ، مگر کھلے طور آنے جانے کی ممانعت تھی ۔ چنانچہ شروع سے ، جب بچہ ابھی سات آٹھ برس کا تھا ، پیر کرامت علی نے ایک دو گھنٹہ روزانہ اُس کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دیا ہوا تھا ۔ ظُہر کے وقت وہ بچے کو لے کر احاطے میں پیپل کے بڑے درخت تلے بیٹھ جاتے اور دِن ڈھلے اُٹھتے ۔ اِس دوران میں وہ بچے کو سکُول کا کام کرواتے ، پڑھاتے ، دوڑ لگواتے ، اور باقی کا وقت گفتگو پر صرف کرتے ۔ جب سلامت علی بڑی جماعتوں میں ہوگیا تو اُس کو ایک ماسٹر وہاں ایک گھنٹہ پڑھانے کے لئے آتا ، اُس کے بعد پیر صاحب ایک گھنٹہ اُس کے ساتھ بات چیت کرتے ۔ اپنی دانست میں وہ بچے کو سب ایسی باتیں ذہن نشین کرا دینا چاہتے تھے جو اُنہوں نے زندگی بھر میں سیکھی تھیں ۔ 'میری زبانی نصیحت پر بلا تامّل عمل مت کرو' ، وہ ہر روز اُس سے کہتے ، 'کِسی کی زبانی نصیحت کو بِلا تامّل مت اپناؤ ، گو اس میں حرج کوئی نہیں ، مگر بہتر یہ ہے کہ تجربے سے سیکھو ۔ دیکھ کر چیزوں کو اُٹھاؤ اور برتو ، پھر دل کو درست لگیں تو اپنا لو ، ورنہ ایک طرف کو چھوڑ دو' ۔ پیر صاحب کے دِل میں اب صرف ایک ہی تمنا تھی ، کہ اُن کا بیٹا وہ سب کچھ تو کرے جو اُنہوں نے کِیا ، اس کے علاوہ وہ کچھ بھی کرے جو وہ خود نہ کر سکے تھے ۔ سب سے بڑی خواہش جو وہ اپنے دِل میں پالتے رہے تھے وہ تھی کہ سلامت علی سیاست میں داخل ہو ، مقابلے کا میدان مارے ، اور سرخرُو ہو ۔ فقیری تو مِل گئی ، اب وزیری رہ گئی تھی ۔ اُس کے بعد دُنیا جہان اُن کی ہتھیلی کے اندر ہوگا ۔ اس مقصد کے لئے اُنہوں نے بیٹے کو ایسے پروان چڑھایا تھا جیسے کِسی اصیل گھوڑے کو دوڑ کے لئے پالا جاتا ہے ۔

انہوں نے سلامت علی کو بتایا کہ ہر بات کو ناپو اور تولو ، دِل میں رکھو ، تاکہ وقت آنے پر اس کا مناسب استعمال کر سکو ۔ اپنی رائے

2009/08/27 19:49

محفوظ رکھو ، کسی خدا کے بندے کو دِل کا حال نہ بتلاؤ ، ورنہ بُہت سی طاقت ہاتھ سے چلی جائے گی ۔ لوگوں کے دِل کا حال جانو اَور اسے بھی اپنے پاس محفوظ رکھو ، تاکہ لوگوں کی طاقت تمہارے ہاتھ میں آجائے ۔ جلد بازی سے کام نہ لو ۔ جب کوئی چیز سامنے آئے تو رُکو ، دو قدم پیچھے ہٹ جاؤ اَور اُس پہ نظر ڈالو ، چاروں جانب سے گھوم کر اُسے پرکھو ، اور اُٹھانے سے پہلے کھوٹی کھری کا عِلم حاصل کرو ۔ کسی فریق میں جا کر شامِل نہ ہو جاؤ ، جب تک کہ اس فریق کا پلّہ بھاری نہ ہو جائے ، کیونکہ شِکست کھانے والے اپنے خیالات کو ساتھ لے کر ہی فنا ہو جاتے ہیں جبکہ جیتنے والوں کے فیصلے دُنیا میں چلتے ہیں ۔ طاقت حاصل کرنے کی ابجد سیکھو ، پھر اس کی گرامر پر حاوی ہو جاؤ ۔ پیر کرامت علی شاہ نے یہ خیالات ہر روز دُہرا دُہرا کر گویا اپنے بیٹے کے خون میں داخل کر دیئے تھے ۔ جب وہ بچہ جوان ہوا تو صرف یہی نہیں کہ اُس کے اُنیس سالہ دل و دماغ میں یہ احساس جاری و ساری تھا کہ وہ ایک بڑی بھاری گدّی کا وارث ہے ، بلکہ اُس کی دُنیا داری کی کھال ایک طرف سے مہین اور قابل رشک جذبات کی حامِل ، اَور دوسری جانب سے اَیسی مضبوط تھی کہ جیسے نفیس ترین بُنتر والا ریشم ۔

سب سے پہلے سلامت علی شاہ نے جِسمانی طاقت کی 'ابجد' سیکھی ۔ ('یہ تمہیں نَو عُمری سے لے کر فخر کے ساتھ سر اُونچا کر کے چلنا سکھائے گی' ۔ پیر کرامت علی شاہ نے اُس سے کہا تھا ۔) بچپن میں دوڑ اَور لڑکپن میں کبڈی اَور کرکٹ میں مہارت حاصل کی ۔ گو اِن کھیلوں میں وہ انعام یافتہ حد تک نہ پہنچ سکا مگر اِن سے ایک طرف اُس کی جِسمانی صحت کی بُنیاد مضبُوط ہوگئی تو دوسری طرف مقابلے کے میدان کا طور طریقہ آگیا ۔ جب وہ کالج میں پہنچا تو اُس نے پڑھائی پر زور دینا شروع کیا ۔ طالبعلمی سیاست میں اُس کی بُہت تھی ۔ ایک تو اپنی وزن دار شخصیت ، دوسرے کچے کھوہ کا صاحبزادہ ہونے کے واسطے سے طالبعلموں میں اُس کی ساکھ تھی ۔ لیکن اپنے والد کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے وہ کبھی اِس سطح کی سیاست میں نہ کُودا ، بلکہ اپنے مُختصر سے گروہ کی معیّت میں کنارے کِنارے کھڑا رہ کر ڈوری پھینکتا رہا ۔ اُسے اِس بات کا عِلم تھا کہ یہ میدان صرف ان باتوں کے دیکھنے بھالنے اَور ان کے جاننے کا تھا ، اصل میدان تو کبھی بعد میں اَور کسی اَور جگہ پہ تھا ۔ اُس کے گروہ میں جو تھا تو وہ چند لڑکے تھے جو اُس کے ہم خیال تھے ، یا وہ تھے جو کچے کھوہ کی گدّی کے حلقہ

2009/08/27 19:49

اثر والے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ پیر کرامت علی نے دور اندیشی سے کام لے کر ، اور اپنے بیٹے کے مستقبل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ، لاہور چھاؤنی کے علاقے میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لی تھی ، جہاں سلامت علی دورانِ تعلیم رہائش پذیر رہا تھا ۔ اُس کے اپنے دوستوں کا حلقہ ، جو ایک ٹھوس اور یکجان گروہ کی حیثیت رکھتا تھا ، اپنی ساکھ کی بدولت ایک خاص اہمیت کا مالک تھا ۔ یونیورسٹی سیاست کا بڑا بڑا اِن کا دم بھرتا تھا ۔ صاحبزادہ سلامت علی کی کوٹھی اِن کا مرکز تھی ، جہاں سے سلامت علی ، جس نے کبھی پتلون کوٹ نہ پہنا تھا بلکہ صاحبزادوں کا روایتی لباس ، شلوار قمیض ، کالی صینک ، اور سردیوں میں اُوپر اُونی واسکٹ پہنے ، ہر روز اپنی سُرخ رنگ کی ہونڈا موٹر سائیکل پر سوار نکلتا اور کالج سے فارغ ہو کر شہر میں پھرتا پھراتا ہوا گھر واپس آجاتا ۔ اسی کوٹھی سے سلامت علی اور اس کے دوستوں نے چار برس تک 'پاور بروکرز' کا کام کیا ، اور قیادت کو اپنے ہاتھ میں لینے کی بجائے اس کی اصل طاقت کا مخزن بنے رہے ۔

اپنے خاص مزاج کی بدولت ہی سلامت علی نے طالبعلموں کے دوسرے بڑے کھیل ، لڑکیوں کے تعاقب میں کبھی حصّہ نہ لیا تھا ۔ اِس مد میں صرف ایک واقعہ اُس کی زندگی میں ہوا تھا ، اور وہ بھی جب وہ دسویں جماعت کا طالبعلم تھا ۔ موضع رکھوال کی ایک لڑکی نسرین سے ، جو نویں جماعت کی طالبہ تھی ، سلامت علی کی جان پہچان ہوگئی تھی ۔ نسرین رکھوال کے ایک درمیانے درجے کے زمیندار کی بیٹی تھی ۔ اُس کا باپ خود بھی آٹھ دس جماعت تک پڑھا ہوا تھا ، اور ہر روز اپنی بیٹی کو تانگے پر بٹھا کر کچے کھوہ کے سکول میں پڑھنے بھیجا کرتا تھا ۔ سلامت علی اُس وقت دسویں درجے کے آخری مہینوں میں تھا ۔ نسرین نقاب نہ پہنتی تھی ، بلکہ گاؤں کے رواج کے مطابق ایک بڑی سی چادر اوڑھے رہتی تھی ۔ چادر کی اوٹ سے نسرین نے جو اپنی گرم گرم آنکھوں کی نظر پھینکی تو سلامت علی کے دِل میں محبت کا جادو جاگ اُٹھا تھا ۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ چند ہفتوں کے اندر اکیلے میں اُن کی پہلی ملاقات ہوگئی ۔ ملاقات کا سلسلہ چند مہینوں تک چلتا رہا ۔ وہ اکثر رات کے وقت رکھوال کے باہر کے ویران کنوئیں پہ ایک دوسرے سے ملتے ۔ رات کے کھانے کے بعد ، جب پیر صاحب حُجرے میں تشریف لے جا چکے ہوتے ، سلامت علی سائیکل پر سوار ہو کر رکھوال

2009/08/27 19:50

کی شوٹ لگاتا اور ویران کنوئیں پہ پہنچ جاتا ۔ نسرین یا تو وہاں پہلے سے موجود ہوتی ، یا کچھ دیر بعد آجاتی ۔ وہاں پہ وہ دو دو گھنٹے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بیٹھے رہتے ۔ ایک بار ، صرف ایک بار ، سلامت علی نے اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے پھوٹتی ہوئی چمکدار سیاہ روشنی سے مغلوب ہو کر اُنہیں چوم لیا تھا ، اور پھر اُس کے رخساروں کو ، پھر ہونٹوں کے کناروں کو ، جس کے بعد نسرین پھلانگ کر دُور ہو گئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے مُنہ کو چھپا کر ، گٹھڑی بن کر زمین پر بیٹھ گئی تھی ۔ کچھ دیر کے بعد جب سلامت علی نے نسرین کی کلائیاں پکڑ کر اُس کے ہاتھ مُنہ سے جُدا کئے تھے تو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا کہ اُس کی ہتھیلیاں آنسوؤں سے تر تھیں ۔ 'کیوں رو رہی ہو ؟' سلامت علی نے پوچھا تھا ۔ 'رو تو نہیں رہی ہوں' ۔ نسرین نے جواب دیا تھا ، 'ہنس رہی ہُوں' ۔

یا پھر ایک بار سلامت علی نے اُسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا تھا اور باہوں کا حلقہ تنگ کرتا گیا تھا حتّٰی کہ دونوں کا سانس گھٹنے لگا تھا ، مگر نسرین نے آواز نہ نکالی تھی ۔ آخر میں اُس نے آنکھیں میچ کر چہرہ اُوپر اُٹھا دیا تھا اور دو لفظ بولی تھی ۔ 'ہائے ، سلامت' ۔ غالباً آدھ گھنٹے تک وہ رات کے اندھیرے میں اسی طرح بے حِس و حرکت کھڑے رہے تھے ۔ دونوں عُمر کی ایسی منزل پر تھے جہاں وہ نہ ابھی پُورے جوان ہوئے تھے اور نہ ہی بچے تھے ۔ اِس حالت میں جذبے کی شدّت نے اُن کے سینوں پہ ایسے نشان ڈال دیئے تھے کہ وہ دو راتیں ۔ جواب سُکڑ کر دو لمحے بن چکی تھیں ۔ جن کے نازک راستے سے اُسے نسرین کا لمس حاصل ہوا تھا ، دیر تک سلامت علی کی یاد میں جادُو کے چراغوں کی مانند جلتی رہی تھیں ۔

پھر ایک روز یہ خبر باہر نِکل گئی ۔ نسرین کے باپ نے سکُول سے اُٹھوا کر اُس پہ پہرہ بٹھا دیا ۔ پیر کرامت علی شاہ نے بیٹے کو بلوایا اور ایک بار اُس کے ساتھ دُرشتی سے پیش آئے ۔ انہوں نے اُس سے کہا کہ اُن کی ساری عُمر کی کمائی ، جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ وہ اُس کو اس قابل بنائیں کہ اپنی وراثت کا اہل بن سکے ، سلامت علی نے خاک میں مِلا دی تھی ۔ اُنہوں نے اُسے بتایا کہ نسرین کا گھرانہ ارائیں قوم سے تعلق رکھنے کے علاوہ ، کِسی طور بھی قابل نہ تھا کہ اُن کی ٹکّر کا گھرانہ سمجھا جائے ، اور دھمکی دی کہ اگر سلامت نے اِس

2009/08/27 19:50

حرکت کو جاری رکھا تو وہ اُسے حیدر آباد سندھ اپنی پھوپھی کے ہاں بھیج دیں گے
اور کبھی اُس کی شکل نہ دیکھیں گے۔

چند مہینے کے بعد سلامت علی میٹرک کا امتحان فرسٹ کی بجائے سکینڈ ڈویژن میں پاس کر کے کالج میں داخل ہونے لاہور چلا گیا۔ وہ کالج کے دوسرے سال میں تھا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آنے پر اُسے اُڑتی اُڑتی خبر ملی کہ نسرین کی شادی مِٹھو چک میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں ایک نوجوان سے ہوگئی تھی جو فوج میں لفٹننٹ تھا۔ دو سال کی کالج اور شہر کی زندگی اور پیر صاحب کی تربیت نے سلامت علی کے اندر ایک جذباتی مدافعت پیدا کر دی تھی، جس کی وجہ سے یہ خبر اُسے اِس طرح لگی جیسے اُنگلی پہ کوئی تیکھا سا کانٹا چُبھ جائے، جس سے آدمی لمحے بھر کو اُف، کر کے اُچھل پڑے، مگر اگلے ہی لمحے جِلد کو اُوپر سے مَل کر بُھول بھلا جائے۔ بس چند لحظے کو اُس کی آنکھوں میں ایک دُور کی جھلک پیدا ہوئی تھی، اُس نے سر اُٹھا کر پیپل کے گھنے پتّوں کے بیچ سے آسمان پہ ایک نظر ڈالی تھی، پھر ہولے سے مسکرا کر اِس خیال کو ذہن سے گویا جھٹک دیا تھا۔ اب کالج میں چار سال گُذارنے کے بعد وہ چھٹیوں میں گاؤں آرہا تھا تو اِس خیال سے کوسوں دُور تھا کہ جادُو کے وہ چراغ جو عرصہ ہوا ایک بار لَو دے کر بُجھ چکے تھے، ایک بار پھر اُس کے راستے میں پڑتے تھے۔ اِس بات کا اُسے کیا عِلم تھا کہ وہ چھٹیاں گذارنے نہیں بلکہ عُمر گذارنے گاؤں کو لَوٹ رہا تھا۔ اُس وقت اِن خیالوں سے بے خبر وہ موٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا اور اُس کے چہرے پر ایک ایسے شخص کا پُراعتماد تبسّم تھا جسے عِلم ہو کہ حُجرے کی دیواروں کے اندر دو مختلف جگہوں پہ لوہے کے سیف نصب تھے جو نوٹوں اور زمینوں کی رجسٹریوں سے بھرے تھے، اور گھر کے اندر ایک بھاری قُفل لگی الماری تھی جو اُوپر سے نیچے تک چاندی اور سونے کے زیورات سے بھری تھی۔

کھچک، کھچک، کھچک، موٹر نے چلتے چلتے دو تین دھچکے کھائے۔ اس کا انجن بند ہوگیا۔ چند گز کے فاصلے تک موٹر خاموشی سے لُڑھکتی رہی۔ ڈرائیور نے سٹیرنگ گھمایا اور سڑک سے اُتار کر کھڑی کر دی۔ دو ایک بار اُس نے چابی گھمائی، مگر گاڑی سٹارٹ نہ ہوئی۔ "کیا ہوگیا"۔ صاحبزادہ سلامت علی نے اخبار پڑھتے پڑھتے پوچھا۔

2009/08/27 19:50

'پتا نہیں جی ۔ پہلے تو کبھی کھڑی نہیں ہوئی؟'
سلامت علی نے اخبار سے نظریں اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا ۔ 'کونسی جگہ ہے؟'
'وہ سامنے مِٹھو چک ہے صاحبزادہ جی'۔

مٹھو چک؟ سلامت علی نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ بھلا مِٹھو چک میں کونسی ایسی بات تھی جو اُس کے ذہن میں کھٹکتی تھی؟ ڈرائیور نے انجن کا ڈھکنا اُٹھا کر اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے شروع کر دیئے ۔ پلگ اور پوائنٹ دیکھے ، فِلٹر اُٹھا کر کاربوریٹر میں پھونکیں ماریں ، پھر کپچوئے کی شکل کا پُرزہ ہاتھ میں اُٹھا کر سلامت علی کی کھڑکی کے پاس لے آیا ۔

'ڈِسٹی بُوٹر کا ہیڈ تڑخ گیا ہے'۔

'پھر اب؟'

'لینا ہی پڑے گا جی'۔

'اِس وقت کہاں سے مِلے گا؟'

'پتا نہیں جی ،' ڈرائیور سڑک کی جانب دیکھ کر بے خیالی سے بولا ۔ 'پیچھے ایک پمپ ہے ۔ شائد وہاں سے مِل جائے ۔'

'کِتنی دور ہے؟'

'کوئی دو میل ہوگا ۔'

'اور کوئی صورت نہیں؟' سلامت علی نے پوچھا ۔

'اِس کے بغیر تو گاڑی نہیں چلے گی جی ۔'

'تو پھر جاؤ ۔'

'آپ ۔ ۔ ۔'

'میں یہیں بیٹھتا ہُوں ۔'

'آپ کو چھوڑنے کا مجھے حکم نہیں جی ۔ بڑے شاہ جی میری جان لے لیں گے ۔'

'بڑے شاہ جی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے ،' سلامت علی نے مُسکرا کر کہا ۔

'بڑے شاہ جی سے کوئی بات چُھپی ہوئی نہیں جی ،' ڈرائیور کی نظر ایک سواریوں سے بھرے تانگے پر پڑی جو مخالف سمت کو جا رہا تھا ۔

'یہ تانگہ خالی کروا لیتا ہُوں ۔ آپ کو چھوڑ کے آجاؤں گا ۔'

2009/08/27 19:51

'نہیں بھئی ،' سلامت علی نے دُہرا کر کہا ۔ 'مجھے کچھ نہیں ہوگا ۔ یہاں انتظار کرتا ہوں ۔ تم جاؤ ۔'

'جیسے آپ کا حکم شاہ جی ۔ میری جان کا خیال رکھیئے گا ۔'

'جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا ۔'

'بس شاہ جی ، آیا کہ آیا ۔'

ڈرائیور نے شہر کی جانب جاتی ہوئی ایک ٹریکٹر ٹرالی کو روکا اور اُس پہ سوار ہوگیا ۔ چلنے سے پہلے کسان جو ٹریکٹر چلا رہا تھا نیچے اُتر آیا ۔ اُتر کر اُس نے جُھکتے جُھکتے دوہرا ہو کر صاحبزادہ سلامت علی شاہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چُوما ، پھر موٹر کی کھڑکی میں ہاتھ داخل کر کے صاحبزادہ کے گھٹنوں کو چُھوا ، اپنی اُنگلیوں کو جو گھٹنوں سے چھوئی تھیں لبوں تک لے جا کر چُوما ، اَور خاموشی سے ٹریکٹر پر سوار ہو کر روانہ ہوگیا ۔

اب سورج غروب ہو رہا تھا ۔ سلامت علی نے دونوں جانب کی کھڑکیاں گرا دیں ۔ ہوا کی تپش اُسی طرح قائم تھی ، مگر اندر ہوا کے دوران سے سانس گھٹنے والی گرمی میں کچھ کمی آگئی ۔ سلامت علی نے تھرموس کھول کر برف والا پانی گلاس میں اُنڈیلا ۔ پھر وہ کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا ۔ اُس نے ایک بازو کھڑکی میں رکھا اور گھونٹ گھونٹ ٹھنڈا پانی پیتے ہوئے سُست سی نظر دُور دُور تک اُس چٹیل سر زمین پر دوڑائی ۔

مٹیالے رنگ کی اتھاہ زمین کے اُوپر جگہ جگہ پر ہوا کے مرغولے گرد کے بھنور لپیٹ میں لئے آسمان کی جانب اُٹھ رہے تھے ۔ یہ جھٹپٹے کے بے اصل وقت کا اثر تھا یا تیزی سے بدلتی ہوئی روشنی کا طِلسم ، سلامت علی کے دماغ میں دُور دراز کے خیال کھلے بندوں آنے اور جانے لگے ۔

یہ زمین جہاں وہ پَل کر جوان ہوا تھا ، جس کے چپے چپے سے واقف تھا ، اِس زمین سے اُس کا رشتہ بھلا کِس صورت کا تھا ؟

شہر اور کالج کی چار برس کی زندگی نے اُسے زندگی کے ایسے رُخ دیئے تھے جن سے گاؤں میں رہ کر اُس کی واقفیت بھی نہ ہو سکتی تھی ۔ پھر سب سے میں دلچسپی اُسے ایسے ایسے مقامات پہ لے گئی تھی جہاں پہ خُدائی کی بیشتر شکلیں

2009/08/27 19:51

اُس کے سامنے روشنا ہوگئی تھیں ۔ قدرت نے اُسے عجیب و غریب ذہن دے رکھا تھا ، جو قوی بھی تھا اور ساتھ ہی ساتھ نازک مزاج بھی تھا ۔ یہ ذہن اکثر اُسے اُلٹے سیدھے سوال کرنے پر اکساتا رہتا تھا ۔

یہ زمین ، جو بوند بوند پانی کو ترستی تھی ، جب پانی مِلتا تھا تو اِتنا کہ اُس میں گُھل مِل کر بہہ جاتی تھی ، جِس پہ آدمی پتّے پتّے کے سائے کو سہکتا تھا ، اِس زمین پہ خُدا کی سلطنت کیسے قائم تھی ؟ یہ لوگ کِس بھرم میں آکر اُس کا ہاتھ چُومتے تھے ؟ یہ زمین جِس پہ سُورج اُس زمانے میں آگ برساتا تھا جِس زمانے میں زمین خوراک اُگلتی تھی اور لوگوں کے بھیجے اُبل پڑتے تھے ، اِس زمین پر لوگ کیونکر اُس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے تھے ، ان بے آواز سوالوں سے سلامت علی کے دِل میں ایک زمین دوز قِسم کا لرزہ پیدا ہوتا تھا ۔ اُس کے اندر ایک شعُور ایسا بھی تھا جو بار بار کہتا تھا کہ اَیسے سوال کرنے کا اُسے حق نہیں پہنچتا ، کہ اُس کی وراثت مُختلف ہے ، یہ بوجھ سہار نہیں سکتی ۔ لیکن اِس قِسم کے بیکار وقتوں میں ، جب اُس کا جی گرمی کی شدّت سے اُکتاہٹ میں مُبتلا ہوتا تھا ، اُس کا ذہن اُسے اکسانے اور ان سوالوں کا کھیل کھیلنے سے باز نہیں آتا تھا ۔ اِس سر زمین سے کیونکر اُسے ایک شدید لگاؤ تھا ؟ یہ سر زمین جِس کی گلیوں میں کُوڑے کے ڈھیر لگے ہیں ، انواع و اقسام کے کھانوں پہ مکھیاں بیٹھا کرتی ہیں جو لوگوں کی غذا کا حِصّہ بنتی ہے ، جہاں اسّی اسّی سالہ سایہ دار درخت کاٹ کر گرا دیے جاتے ہیں اور میلوں تک سبزے کا نشان نہیں مِلتا ، جہاں گرد حیوان و مکان کے خفیہ ترین سوراخوں میں داخل ہو کر جم جاتی ہے ۔ اِس سرزمین کی اُس کے دِل میں چاہت کِس وجہ سے تھی ؟؟ ؟

اب رات پڑ چکی تھی ۔ لُو کی بھٹی اُسی طرح دہک رہی تھی ۔ آسمان کے دامن سے طلوع ہوتا ہوا سولہ روز کا چاند آگ کا گولہ دکھائی دے رہا تھا ۔ سلامت علی کی تھرموس میں ٹھنڈا پانی تقریباً ختم ہو چُکا تھا ۔ ایک تانگہ موڑ دیکھ کر آہستہ ہوا ، پھر تھوڑی دُور پر جا کر رُک گیا ۔ چاند کی روشنی میں کِسی صاحبزادہ سلامت علی کو ، جو کھڑکی سے مُنہ نِکالے بیٹھا تھا ، پہچان لیا تھا ۔ تانگہ بان اور پانچ چھ سواریاں سب تانگے سے اُتر کھڑے ہوئے ۔ موٹر کے پاس آ کر سب نے باری باری جُھک کر دونوں ہاتھوں میں صاحبزادے کا ہاتھ پکڑ چُوما ، پھر اُس کے گھٹنوں کو چُھو کر اپنی انگلیوں کو لبوں سے لگایا ۔

2009/08/27 19:52

'موٹر خراب ہوگئی ہے صاحبزادہ جی ؟' تانگہ بان نے پوچھا ۔

'ہاں ۔ ڈرائیور پُرزہ لینے گیا ہوا ہے ۔'

'تانگہ حاضر ہے سرکار ، آپ کو چھوڑ کے آتا ہوں ۔'

'ڈرائیور آتا ہی ہوگا ۔ تُم جاؤ جہاں جا رہے ہو ۔'

'نہیں سرکار ،' سب کسان یک زبان ہو کر بولے ۔ 'ہم پیدل چلے جائیں گے ۔ تانگہ حاضر ہے ۔'

'نہیں بھئی ، تم اپنا رستہ لو ۔ ڈرائیور آنے ہی والا ہے ۔'

'جیسے حکم سرکار ۔ کہو تو گاڑی کو دھکا لگا کے دربار پہ چھوڑ آئیں ۔'

'نہیں نہیں ۔ کوئی ضرورت نہیں ۔'

'شکر ہے بابا چدّر والے کا حضور ، ہماری تو آخرت کے والی وارث آپ ہی ہیں ۔'

'اللہ کے حوالے ،' سلامت علی نے ہاتھ کے اشارے سے اُنہیں جانے کو کہا ۔ سب کے سب پچھلے پاؤں چلتے ہوئے تانگے تک گئے اور اس میں سوار ہو کر چل دیے ۔

اُنہیں جاتے ہوئے دیکھ کر یکایک سلامت علی کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی مانند کوندا ۔ یہ غریب کسان زندگی کی خوبصورتی سے کِس درجہ عاری تھے ، اُس نے سوچا ! یہ سرزمین خوبصورتی کو جنم دینے میں اِسقدر خسیس واقعہ ہوئی تھی کہ یہ لوگ اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے ، پھر آخر ہم جیسے لوگوں سے انہیں آخرت کی خوبصورتی کا وعدہ حاصل ہوتا تھا ۔ اِسی پہ یہ خُدا کی سلطنت قائم تھی ۔

سلامت علی ، ساری شام میں پہلی بار ، موٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور سڑک کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا ۔ اُس کے دل میں تحریک تھی ۔ محسوس کر رہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار اُس کے اندر بُہت سے شک و شُبہ کا بوجھ تحلیل ہوتا جا رہا تھا ۔ وہ ایک لامکانی حُسن کا وعدے دار تھا ، اِس خیال نے اُس کے دِل کو سہارا دیا تھا ، جو آہستہ آہستہ ، جیسے جیسے ہوا کی تپش میں کمی آرہی تھی ، فضا میں اٹکی ہوئی دِن بھر کے گرد زمین پہ بیٹھتی اور آسمان صاف اور روشن ہوا جاتا تھا ، ایک پُرمسرّت اعتماد میں بدلتا جا رہا تھا ۔ اِس خیال میں کیسی جادو کی طاقت تھی ۔ یہی وجہ تھی ، اُس نے محسوس کیا ، کہ یہ سرزمین اپنے رِشتے کے اندر اُسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی ۔

2009/08/27 19:52

سلامت علی کے ڈرائیور کو شہر کے اندر جا کر لوٹنا پڑا تھا ۔ جب وہ گاؤں پہنچے تو رات ایک پہر جا چکی تھی ، مگر سلامت علی کی ماں اُس کا کھانا لے کر بیٹھی اُس کا انتظار کر رہی تھی ۔ سلامت علی نے ٹھنڈے پانی کا غسل کر کے کھانا کھایا ۔ پھر وہ صحن میں بیٹھ کر ماں سے باتیں کرنے لگا ۔ گھر میں کام کرنے والی دو عورتیں اور دو تین لڑکیاں فارغ ہو کر ایک طرف چارپائیوں پہ بیٹھی سونے کی تیاری کر رہی تھیں ۔ صحن میں دو مچھر دانیاں لگی تھیں ۔ گھٹتے ہوئے چاند کی تاریک سی روشنی میں بیٹھ کر ماں کی باتیں سُنتے اور اُن کا جواب دیتے ہوئے سلامت علی کے ذہن سے پچھلی کئی راتوں کی یاد سرسراتی ہوئی گذر گئی ۔ پیٹ بھر کھانے ، ماں کی صُحبت ، اور یادوں کے اِس ماحول نے اُس کے ذہن میں ایک یکسوئی پیدا کر دی تھی ۔ بگڑی ہوئی گاڑی میں رات گئے تک بیٹھے انتظار کرنے کی کوفت اُس کے دِل سے نِکل چکی تھی ۔ کچھ دیر کے بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا ۔

'میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں ماں ،' وہ ہنس کر بولا ۔ 'شاہ جی کی حاضری دے آؤں ۔' ۔

احاطے کے اندر پندرہ بیس آدمی چارپائیوں پہ سونے پڑے تھے ۔ صرف دو درویش لڑکے ایک دُور بچھی دری پہ بیٹھے دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے ۔ پیر کرامت علی شاہ حُجرے میں جا چکے تھے ۔ سلامت علی نے حُجرے کے دروازے پہ ہاتھ رکھا تو دروازہ خاموشی سے وا ہو گیا ۔ حُجرے کے اندر جو منظر اُس نے دیکھا اُس منظر نے اُسے اُلٹے پاؤں لوٹنے پہ مجبُور کر دیا ۔

رات کے وقت حُجرے کے اندر پیر صاحب کے کِسی بڑے مرید کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہ تھی ۔ خود سلامت علی نے رات کے وقت وہاں پر صرف چند ہی بار قدم رکھا تھا ۔ پھر اتفاق کی بات تھی کہ جِس منظر سے اُس کا سامنا اُس رات کو ہوا اُسے وہ زندگی میں ایک بار پہلے دیکھ چُکا تھا ۔ یہ دس برس پیشتر کی بات تھی ۔ وہ اُس وقت نَو برس کا تھا ، اور رات نیند کھل جانے کی وجہ سے بھٹکتا ہوا اِدھر آنکلا تھا ۔ اُس گئی گذری رات کو جب وہ ایک بچہ تھا وہ ایک انوکھے جادُو کے زیرِ اثر آیا تھا ۔ اُس کے تنے ہوئے نتھنوں میں ہوا کی سی اُڑان تھی ۔ اب اس نظارے کو سامنے پا کر سب سے پہلے اُس نے اپنے جوان بدن میں ایک لمحے کو وہ پرانی اُڑان محسُوس کی ۔ پیر کرامت علی شاہ کے

2009/08/27 19:52

سامنے ایک الف ننگا بدن لاش کی صورت زمین پر سیدھا پڑا تھا ۔ پیر صاحب اکڑوں بیٹھے اُس بدن پر سر سے لے کر پاؤں تک ہولے ہولے اپنا ہاتھ پھیرے جا رہے تھے ، اور ساتھ ساتھ حلق اور ناک کے اندر سے وہی پرانی لمبی لَے والی گنگناتی ہوئی آواز پیدا کئے جاتے تھے جیسے وِرد میں مصروف ہوں ، یا کوئی فریاد کر رہے ہوں ۔ سلامت علی اُلٹے پاؤں مُڑنے ہی والا تھا کہ اچانک اُس پُرسکوت جسم میں ایک ایسی حرکت ہوئی کہ سلامت علی کا دل اُچھل پڑا ۔ اُس جسم کا کوئی انگ اپنی جگہ سے نہ ہلا ، صرف چہرے نے آنکھیں کھول دیں ، جیسے کہ اُس کے دل پہ کوئی بے آواز دستک ہوئی ہو اور وہ آنکھیں یکایک جاگ پڑی ہوں ۔

وہ آنکھیں سلامت علی کے دِل میں اٹک گئیں ۔ لمبی پلکوں والی بڑی بڑی ، سیاہ چمکدار اور روشن آنکھیں ٹک ٹک چھت کو تکے جا رہی تھیں ۔ دفعتاً اُس سارے جسم میں ایک شدید جُھرجھری پیدا ہوئی ، سر اُوپر اُٹھا ، اور مُنہ سے ہلکی سی چیخ نِکل گئی ۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی ۔ پہلے اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتیوں کو ڈھانپا ، پھر گھٹنے اُٹھا کر چھاتی سے لگائے اور ہاتھوں سے چہرہ چُھپا کر گٹھڑی سی بن گئی ۔ ایک لمحے کے بعد اُس نے والہانہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے اور اپنے کپڑوں کے چھوٹے سے ڈھیر پہ جا گری ۔ سلامت علی کے پاؤں زمین میں گڑے تھے ۔ اُس کے دماغ سے خیال غائب ہو چکے تھے ، صرف آنکھیں کام کر رہی تھیں ۔ اُس کا دل اور دماغ اِن چند لمحوں کے دوران مکمل آرام کی حالت میں تھا ۔ اِس خالی الذہن صورت میں کھڑے کھڑے اُس کے دِل میں تعجب پیدا ہوا کہ شام کے وقت کیوں اُس کو یاد نہ آرہا تھا کہ مِٹھو چک میں کیا بات تھی ؟ مِٹھو چک میں نسرین بیاہ کے گئی تھی ۔ اِس عام فہم بات کو وہ کیسے بُھول گیا تھا ؟ نسرین کا چہرہ بھلا تک رہا تھا ۔ جسم بھی شائد کچھ موٹا ہو گیا تھا ۔ چار سال ۔ چار سال میں وہ بدل گئی تھی ؟؟ ۔

اب نسرین کپڑوں کو دونوں ہاتھوں میں لئے ، اپنے گندمی بدن کے آگے ، پیروں کے پنجوں پہ گویا ہوا میں اٹکی کھڑی تھی ۔

'شاہ جی ،' وہ بے دم آواز میں بولی ، "اِستخارہ کر رہے تھے"، اور کہتے ہی دیکھتے ، کپڑوں کو جسم پہ دبائے بھاگتی ہوئی کمرے سے نِکل گئی ۔

2009/08/27 19:53

پیر کرامت علی لڑکی کے ساتھ ہی اُچک کر کھڑے ہو گئے تھے ۔ اِس میں اُن کی چادر سر سے اُتر گئی تھی اَور ایک کندھے سے نیچے ڈھلک آئی تھی ۔ ایک لمحے کی اِس حرکت نے اُن کے وجُود سے بیسیوں سہ سال گھٹا دیئے تھے ۔ اُن کے چہرے پہ ہراس کی کیفیت تھی ۔ وہ اس طرح کھڑے تھے جیسے سہما ہوا بچہ کندھے خم کئے ، آنکھیں اُٹھائے اقبالِ جُرم کی حالت میں کھڑا ہوتا ہے ۔ گو اُن کی چادر صِرف سر اَور ایک کندھے سے اُتری تھی مگر سلامت علی کو محسُوس ہو رہا تھا جیسے وہ یکسر برہنہ ہو گئے ہوں ، جیسے اُن کے تیور کی سنجیدگی اَور شخصیت کا تمامتر تقدس ایک فالتو کھال کی مانند اُتر کر گر پڑا ہو ۔ اُن کے انداز کا بھاری بھر کم پن غائب ہو چُکا تھا اَور لگتا تھا کہ کِسی لمحے بھی وہ چڑیا کی طرح پُھدک کر کہیں اَور جا کھڑے ہوں گے ۔ اُنہیں دیکھتے ہوئے سلامت علی کے مُنہ سے صرف ایک لفظ سوال کے طور نِکلا ۔

'تسرین؟؟'

'اِسے اولاد نہیں ہوتی ،' پیر کرامت علی نے چھوٹی سی بے یقین آواز میں جواب دیا ۔

'آپ ۔ ۔ ۔ ؟' سلامت علی آنکھیں پھاڑے اپنے باپ کو دیکھتا رہا ۔ اُس کے چہرے پہ تعجب اَور آزردگی کے مِلے جُلے آثار تھے ۔

آخر پیر کرامت علی اپنے بیٹے کی نظروں کی تاب نہ لا کر جہاں کھڑے تھے وہیں پہ بیٹھ گئے ۔ اُن کا جِسم نحیف و نزار دکھائی دے رہا تھا ۔ اُنہوں نے ہاتھ اُٹھا کر بیٹے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔

'میں کچھ نہیں کرتا ،' وہ بولے ، 'کُچھ بھی نہیں کرتا ۔'

اُن کے مُنہ سے آواز اَیسے نِکلی جیسے اُن کا حلق سُوکھ گیا ہو ۔ 'میں تو کِسی قابل نہیں ہُوں ۔'

سلامت علی فرش پر اپنے باپ کے بالمقابل جا بیٹھا ۔ اُس سے حیرت زدہ مُنہ سے ایک بار پِھر صرف ایک ہی لفظ نِکل سکا ۔

'اِستخارہ ۔ ؟'

'یہ خدا کی قدرت ہے ،' پیر کرامت علی بولے ، 'میں تو عورت کے قابل ہی نہیں رہا ۔'

2009/08/27 19:53

پیر کرامت علی نے ایک لحظے کو نظریں اُٹھائیں ، پھر گرا دیں ۔ اُنہوں نے بیٹے کو مُستقل جواب طلب نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا ۔ وہ دوبارہ بولے ،

'ایک عورت تھی ۔ اُس نے مجھے اِس قابل نہیں چھوڑا ۔ میری مردانگی چھین کر لے گئی ۔'

'کون تھی ؟'

'کوئی عورت تھی ۔ تُم نہیں جانتے ۔ قاتلہ تھی ۔'

'قاتلہ تھی ؟'

'ہاں ۔'

'کیا ہوا تھا ؟'

'اب میں کیا بتاؤں ۔ اس قصے کو چھوڑو ۔ میں تُمہارا باپ ہوں ، بس میری بات پہ یقین رکھو ۔'

'شاہ جی ،' سلامت علی بولا ، 'میں نے ہمیشہ آنکھ بند کر کے آپ کی بات پر ایمان رکھا ہے ۔'

'درست ہے ۔ تُم میرے بیٹے ہو ۔'

'مگر شاہ جی ، آپ ہی کا سبق ہے کہ بات کی حقیقت معلوم کرو ۔ یہ بات مجھے بتائیے ۔'

پیر کرامت علی کئی منٹ تک فرش پر نظریں جمائے بیٹھے رہے ، گویا اپنے شکنجے میں آپ ہی کسے جا رہے ہوں ۔ ایک دو بار بیٹے کو باز رکھنے کی خاطر اُنہوں نے سر اُٹھا کر عمداً اُس کی آنکھوں میں دیکھا ۔ مگر سلامت علی کی پُر تکرار نظروں کے سامنے اُن کی رُوح سُکڑ گئی ۔

'لمبی کہانی ہے ۔ کئی برس پُرانا قِصہ ہے ۔'

'شاہ جی ، جو کچھ بھی ہے ، مجھے کھول کر بتائیے ۔'

2009/08/27 19:53

2009/08/27 19:53

باب پنجم

تین قتلوں کی حکائت :۔

اب وقت ایک بار پھر قریب اٹھارہ برس پیچھے کی جانب لوٹتا ہے ۔ پیر کرامت علی جو کہانی بیان کرتے ہیں وہ اِس سچے واقعے پر مبنی ہے :

آزادی کے پہلے پہلے سالوں کا زمانہ ہے ۔ لوگوں کے دماغوں میں ابھی کامیابی کا اَور ایک خوش آئند زندگی کا نشہ باقی ہے ۔ ماحول بدل چُکا ہے ۔ نوکریوں کے اَور کاروبار کے اَور افسروں تک رسائی کے مواقع زیادہ سے زیادہ بہم پہنچائے جا رہے ہیں ۔ لُٹے پٹے مہاجرین کا سِلسلہ اختتام کو پہنچ رہا ہے ۔ ان حالات میں یکایک اخباروں میں ایک سنسنی خیز وارداتِ قتل کا غلغلہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے ۔ ایک تعلیم یافتہ جوان عورت نے تین مردوں کو ہلاک کر دیا ہے ۔ مُلک بھر کے عوام انگشت بدنداں ہیں کہ کیونکر ایک شریف گھرانے کی پڑھی لکھی عورت ، جو گورنمنٹ سکول میں سابقہ ٹیچر رہ چکی ہے ، اِس بہیمانہ جُرم کی مُرتکب ہوئی ۔

یہ تینوں قتل سَو میل کے رقبے اَور چوبیس گھنٹے کے عرصے کے اندر واقع ہوئے ۔ تیسرے قتل کے بعد مُلزمہ خود جا کر پولیس تھانے میں حاضر ہوئی ، اَور پہلی رپورٹ میں درج ہوا کہ مُلزمہ نے اقبالِ جُرم کیا ۔ لیکن سوائے اِس رپورٹ کے اقبالِ جُرم کا ثبوت اَور کہیں پہ نہیں مِلتا ، کیونکہ باقی کی تمامتر کاروائی کے دوران مُلزمہ نے مُنہ سے ایک لفظ نہیں نکالا اَور نہ ہی سر کی جُنبش سے ہاں یا نہ کرنے کی روادار ہوئی ۔ یہاں تک کہ دفاع کی جانب سے کاغذ قلم کی پیش کش بھی کی گئی جو اُس نے ٹھکرا دی ، یعنی حسب معمول گُنگ بیٹھی ٹک ٹک اپنے سامنے یا پھر زمین پہ دیکھتی رہی ۔ دفاعی وکیل ، جو مُلزمہ کی بہن اَور بہنوئی نے مقرر کیا تھا ، مُلزمہ کے عدم تعاون کے پیشِ نظر کچھ بھی نہ کر سکا ، سوائے اِس

کے کہ پراسیکیوشن کے نکات کا حسبِ مقدور جواب دیتا رہا ۔ دوسری طرف پراسیکیوشن کے ہاتھ میں بھی کوئی ناقابلِ رد کیس نہیں تھا ۔ تینوں وارداتوں میں کِسی ایک کا بھی آلۂ قتل برآمد نہیں ہو سکا تھا ۔ پراسیکیوشن مُلزمہ کا کِسی ایک مقتُول کے ساتھ کِسی قِسم کا تعلّق ثابت کرنے سے قاصر رہی تھی ۔ علاوہ ازیں کوئی گواہان ، عینی یا غیر عَینی موجُود نہ تھے ۔ غرضیکہ اقدامِ قتل کے محرکات ڈھونڈے نہ مِلتے تھے ۔ پراسیکیوشن کے تمامتر دلائِل واقعاتی شہادتوں ، یا مُلزمہ کے از خود پیش ہونے اَور اُس کے نام نہاد اقبال جُرم پر مبنی تھے ۔ تاہم ایک نُہت بڑا عنصر جو مُلزمہ کے خلاف جاتا تھا وہ اُس کے صنفِ نازک سے تعلّق رکھنے کا تھا ۔ اُن دنوں حال ہی میں ایک اَور مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تھا جِس میں ایک عورت نے اپنے آشنا کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا ۔ اُس مقدمہ میں دفاع نے عدالت سے التجا کی تھی کہ اِس کیس کو اُنہیں نظروں سے دیکھا اَور اُسی سطح پر پرکھا جائے جیسے کہ کِسی عام مقدمۂ قتل کو ۔ یہ ایک باریک نُکتہ تھا جِس پر دفاع نے کسی حد تک اپنے دلائِل کی بُنیاد رکھی تھی ۔ مگر اِس پر عدالت کی رُولِنگ اُن کے خلاف گئی تھی ۔ مُمتّز جج نے کہا کہ اِس کیس کو برابر کی سطح پر نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اس میں عورت کی دِل لُبھانے اَور مرد کو ورغلانے کی قوت کا عنصر شامل ہے ۔ اَور یہ ایک ایسا آلہ ہے جو مرد کے حِصّے میں نہیں آیا ۔ (جج نے (Instrument ofAllure) کی اصطلاح استعمال کی تھی ۔ دفاع نے اِس نُکتے کو ایک تکنیکی نُکتے کی حیثیت سے پیش کر کے اس پر بحث جاری رکھنے کی التجا کی ، جو عدالت نے کچھ پس و پیش کے بعد منظور کر لی ۔ پھر پورا ایک دن اِسی بحث میں گذر گیا ۔ مرد کو ورغلانے کے اِس 'آلے' کو قِسم قِسم کے زاویوں سے جانچا اَور زیرِ بحث لایا گیا ، جِس کے دوران متعدّد بار کاروائی نے مزاحیہ صورت اختیار کر لی اَور عدالت کے سامعین ، اَور باہر اخبارات کے قارئین کی تفریحِ طبع کا باعث بنی ۔) ۔

دوسری وجہ جِس سے عدالت کے رویّے کا تعیّن ہوا وہ مُلزمہ کا عدم تعاون تھا ۔ مُلزمہ کے 'اِس حقارت آمیز سلوک' سے عدالت اِتنی چڑ گئی کہ دفاع کے آخری حربے ، یعنی مُلزمہ کے دماغی توازن بِگڑ جانے کی اپیل کو خاطر میں نہ لائی ۔

سیشن کورٹ سے مُلزمہ کو دو بار پھانسی ، سات سال قید بامُشقت اَور

2009/08/27 19:54

بیس ہزار روپے جُرمانہ ، ایک سال قید بامشقت اور دو ہزار روپے جُرمانہ ، بصورت عدم ادائیگی چودہ ماہ اَور دو ماہ مزید بامشقت ، کی سزا ہوئی ۔

مقدمے کی طویل کاروائی کے باوجود یہ سوال کہ کیوں ایک جوان ، خوش شکل ، شریف اَور تعلیم یافتہ لڑکی اَیسے اِنسان سوز جرم کی مُرتکب ہوئی ، ایک سربستہ راز ہی رہا ۔ کِسی بشر پہ یہ نہ کھلا کہ کیونکر یہ مُلزمہ ، چہرے سے کسی تاثر کا اظہار کئے بغیر ، سزا سُن کر خاموشی سے اُٹھی اَور پھانسی کے تختے پر چڑھنے کے لِئے چلی گئی ۔ ۔

جیل کا منظر :۔

اب یہ منظر جیل کو منتقل ہوتا ہے ، جہاں قاتلہ رضیہ سلطانہ عرصہ دو ماہ سے پھانسی کی کوٹھری میں مقیّد ہے جبکہ باہر اپیل کی کوششیں ہو رہی ہیں ۔ پہلے اس کی بہن درخواست دیتی ہے کہ عدالت عالیہ میں اپیل کرنے کی اس کی استطاعت نہیں ، ملزمہ کو بے حیثیت جان کر حکومت کی جانب سے اپیل کی جائے ۔ حکومت حسبِ دستور وکیل مقرر کر دیتی ہے ۔ جو ابتدائی کاروائی کر کے عدالت عالیہ سے اپیل دائر کرنے کی مہلت حاصل کر لیتا ہے ۔ ، پھر پھانسی کو رکوانے کا حکم جاری کروانے کی کاروائی شروع کر دیتا ہے ۔ ساتھ ہی وہ مصر ہو جاتا ہے کہ ملزمہ کی جانب سے پیش رفت کی صورت ہونی چاہیے ۔ اگر وہ خود درخواست نہیں دیتی تو کم از کم رضامندی کا اشارہ دے سکتی ہے ۔ رضیہ سلطانہ کی بہن مختار سلطانہ پھر کوشش کرتی ہے ۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کی نسبت اس قدر مختلف عورت ہے کہ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا کہ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں ۔ اپنے خاندانی وصائف کی حامل ، دھیمی اور سلجھی ہوئی طبیعت کی گھر گرہستن ، سیدھی سادی تین بچوں کی ماں ہے ۔ سارا سارا دن جیل کے باہر ، کبھی بچوں کے ساتھ کبھی ان کو چھوڑ کے ، آکر کر بیٹھی رہتی ہے ، پھر اسے چوتھے روز وکیل کی وساطت سے بہن کے ساتھ ملاقات کی اجازت حاصل کرتی ہے ۔ ملاقات کے دوران بہن کی منت سماجت میں لگی رہتی ہے ۔ کہتی ہے مری بہن ، اپنے اوپر تو رحم نہیں کھاتی ، کیا میرے اوپر بھی یہ ظلم روا رکھے گی ؟ میری طرف دیکھو ، میرے ساتھ بات کرو ، تمہیں یاد نہیں ہم ایک ساتھ کھیلا کرتی تھیں ۔ ایک دوسری کے بال نوچا کرتی تھیں ، پھر انہی میں کنگھی کیا کرتی تھی ۔

2009/08/27 19:54

میرے ماں بات کی نشانی ہو ، تمہاری آواز کو ترس گئی ہوں ۔ تمہیں کچھ یاد نہیں ؟ رضیہ سلطانہ کا دل گویا پتھر ہو چکا ہے ۔ بڑی بہن کی طرف نہ دیکھتی ہے نہ بات کرتی ہے ۔ ادھر وکیل اصرار نہیں چھوڑتا کہ رضیہ سلطانہ کے تعاون کے بغیر اپیل بیکار ہے ، پھر وہ الٹی میٹم دے دیتا ہے کہ تین دن کے اندر اس بارے میں پیش رفت نہ ہوئی تو وہ مزید کاروائی ترک کر دے گا ۔ ممتاز سلطانہ پھر ایک بار کوشش کرتی ہے ، مگر بے سود ۔ رضیہ ٹس سے مس نہیں ہوتی آخر وکیل اپیل کو واپس لے لیتا ہے ۔ معاملہ ختم ۔ سیشن کی سزا بحال رہتی ہے ۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ بلیک وارنٹ جاری ہو جائے گا ۔ اس میں کوئی شک نہیں ۔

اِس سارے عرصے میں مُجرمہ نے اپنا طور برقرار رکھتے ہوئے مُنہ سے کوئی بات نہیں نِکالی ، بس ایک گُنگ خاموشی اپنے اوپر طاری کِئے کوٹھڑی میں وقت گُذار رہی ہے ۔ علاوہ اِس چُپ کے اَور کوئی آثار اُس کے اُوپر نمایاں نہیں ہیں جِن سے اُس کی دماغی صحت پر شک ہو سکتا ہو ۔ کھانا پینا ، رفع حاجت ، سب ضروریاتِ زندگی بقدرِ ضرورت نبٹاتی ہے ۔ البتہ نماز ادا نہیں کرتی ۔ پھانسی کی کوٹھڑی والوں کا دستُور ہے کہ اُن میں سے بیشتر دِن اَور رات کے اکثر اوقات تلاوتِ قرآن اَور نماز ادا کرنے میں صرف کرتے ہیں ۔ بڑے بڑے پیشہ ور مُجرم 'کوٹھی لگتے' ہی استغفار پڑھ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیتے ہیں ۔ یہ بات مصدقہ ہے کہ جیل کے دوسرے حصّوں کی نِسبت 'کوٹھی' والوں کا ماحول پاک صاف اَور عبادت گذار ہوتا ہے ۔ رضیہ سلطانہ کا رویّہ اِس ضِمن میں مُختلف ہے ۔ نہانا دھونا اَور تبدیلیٔ لباس تو درکنار ، اپنے آپ کو ٹھیک سے صاف بھی نہیں رکھتی ۔ بدنی طہارت کا اُسے کچھ خیال نہیں ، سرسری پُونچھ پانچھ کر فارغ ہو جاتی ہے ۔ ساتویں آٹھویں روز لیڈی وارڈر آ کر زبردستی اُسے نہلاتی ہے ، اُس کے کپڑے اُتار کر اُس کے گرد چادر لپیٹ دیتی ہے اَور کپڑے دھونے کو لے جاتی ہے ۔ مُجرمہ کو اپنے ستر کا بھی پاس نہیں ہے ۔ چادر سینے سے ڈھلک جائے تو ڈھلک جائے ، سیدھی کرنے کی توفیق اُسے نہیں ہوتی ۔ جب وارڈر دُھلے ہوئے کپڑے لا کر اُسے پہنانے لگتی ہے تو وارڈر کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے [illegible] اُسے کہتی ہے نماز پڑھو ، توبہ کر لو ، تو مُجرمہ رضیہ سلطانہ اُسے جواب دیتی ہے ، 'میں ناپاک ہوں ۔ نماز کیسے

2009/08/27 19:54

پڑھوں ۔' نہانے کے بعد بھی یہی بہانہ استعمال کرتی ہے ، 'میں ناپاک ہوں ۔' بس یہی ایک جملہ اُس کے مُنہ سے دو مہینے میں ادا ہوتا ہے ۔ سب حیران ہیں کہ یہ کیسی عورت ہے ، نہ مقدمے میں اپنی مدافعت کی ، نہ اپیل میں مدد ، نہ جُرم کی کوئی وجہ بیان کی ، اَور نہ اب توبہ ہی کرتی ہے ۔ نہ بولتی ہے نہ چاہتی ہے ، بس مُہر بلب کوٹھی لگی ہوئی ہے ۔

صرف دو لفظ مزید اُس کے مُنہ سے پہلے ہی روز نکلے تھے ، اَور وہ بھی بے اختیار سخت حیرانگی کے عالم میں ، جب اُس نے کوٹھڑی کے باہر جوان وارڈرن کرامت علی کو کھڑے ہوئے دیکھا تھا ۔

'کرامت ،' وہ کھلے مُنہ سے بولی تھی ۔ 'تُم ؟'

اُس کے بعد پھر وُہی چُپ ۔

اب حقیقت کُھلتی ہے کہ رضیہ سُلطانہ کرامت علی کی پُرانی ساتھی اَور اُس کے جگری دوست فیروز شاہ کی محبُوبہ تھی ، جس کے جُرم کا اخباروں میں تذکرہ پڑھ کر کرامت علی بھی ہزاروں لاکھوں دوسرے لوگوں کی طرح دانتوں میں اُنگلیاں دابے ہوئے تھا ، گویہ اُس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اُسی کی جیل میں آکر کوٹھی لگے گی ۔ یہ اتفاق تھا یا خُدا کا کرنا ، کہ زندگی میں ایک بار پھر اِن دونوں کا سامنا ہونا تھا (جس کے دور رس نتائج کا اُس وقت کسی کو علم بھی نہ تھا ۔) رضیہ سلطانہ کو دیکھ کر کرامت علی کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ 'رضو ،' وہ بے اختیار پُکار اُٹھا تھا ، 'تُم یہاں آگئی ہو ؟' اَور رضیہ سلطانہ جواب میں مُنہ موڑ کی بیٹھ گئی تھی ۔

وہ دِن تھا اَور آج کا ، کرامت علی لاکھ کوشش کرتا ہے کہ رضیہ سلطانہ کوئی بات مُنہ سے نکالے ، کچھ اُگلے ، کوئی راز فاش کرے ۔ وہ اُسے خدا کا ، مذہب کا ، پُرانی رفاقت کا ، اپنے مُردہ دوست کا ، حُب الوطنی کا ، قانون کا ، آخرت کا واسطہ دیتا ہے کہ وہ کچھ بتائے ، کچھ بولے ، خدا کے حضور بخشش طلب کرے ۔ مگر رضیہ سلطانہ نے ایک چُپ جو سادھ لی ہے اُسے نہیں توڑتی ، اُس کے لب وا نہیں ہوتے ۔ آخر اُس کی خاموشی ایک بھاری وزن بن کر کرامت علی کے دِل پر بیٹھنے لگتی ہے ۔ یہاں سے رضیہ سلطانہ کا رویّہ ، اُس کے حرکات و سکنات ، اُس کا جُرم ، حتّٰی کہ اُس کا وجود تک کرامت علی پہ اثر انداز ہونا شروع ہوتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ رضیہ سلطانہ کی چُپ اُسے کھا گئی ہے ۔

2009/08/27 19:54

رر حقیقت یہ چُپ اُس کی ساری شخصیت پہ چھاتی چلی جاتی ہے ۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ نہ ہنستا ہے ، نہ بولتا ہے ، نہ کوئی بات کرتا ہے ، بس اپنے جسم کا بوجھ اُٹھائے اپنا کام کرتا رہتا ہے ، اَور باقی کا وقت اپنے دِل کے اندر سکڑ کر بیٹھا رہتا ہے ۔ زیادہ سے زیادہ دِن میں ایک آدھ بار رضیہ سلطانہ کی کوٹھڑی کا چکر لگا لیتا ہے ۔ وہاں کوٹھڑی کے باہر چند منٹ کو رُک کر خاموشی سے قیدی کو دیکھتا ہے ، جو اندر بیٹھی ٹک ٹک دیوار کو دیکھ رہی ہوتی ہے ، یا کبھی خاموشی سے کرامت علی کو دیکھنے لگتی ہے ۔ پھر وہ واپس آجاتا ہے ۔ وہ اُس کا معمول بن گیا ہے ۔ اُسے فیروز شاہ کی یاد بھی ستاتی رہتی ہے ۔ عجیب بات ہے کہ جب سے فیروز شاہ کی موت واقع ہوئی ہے وہ کبھی کرامت علی کو اتنی کثرت سے یاد نہیں آیا جتنا اِن دنوں میں آتا ہے ۔ اُسے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اِس جُرم اَور فیروز شاہ کی موت کے درمیان گہرا رشتہ ہے ۔ یہ سوچتے سوچتے اُسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے فیروز شاہ ابھی کل ہی مرا ہو اَور اُس کی تازہ تازہ لاش آس پاس ہی کہیں پہ پڑی ہوئی ہو ۔ اُسے جاگتے ہوئے بھی 'نظارے' نظر آنے لگتے ہیں ۔ رضیہ سلطانہ کی خاموشی اَور فیروز شاہ کی یاد نے مِل جُل کر اُس کی رُوح کو پِسل کے رکھ دیا ہے ، لیٹا ہے تو اُٹھ بیٹھنے کو اَور بیٹھا ہے تو اُٹھ کھڑا ہونے کو جی نہیں کرتا ۔ یہاں تک کہ اُس کی بیوی نے بھی اُس کی حالت دیکھ کر تذکرہ کیا ہے ، مگر کرامت علی میں اتنی ہِمت بھی نہیں رہی کہ بیوی کی بات کا ڈھنگ سے جواب دے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی قوتِ ارادی فالج کے اثر میں آگئی ہے ۔

اِسی طرح آخری دِن آپہنچتا ہے ۔ دستور کے مطابق اسسٹنٹ سُپرنٹنڈنٹ اَگر رضیہ سلطانہ کو اطلاع دیتا ہے کہ اگلے دن صُبح صادق کے وقت اُسے پھانسی پر چڑھایا جائے گا ۔ آخری ملاقاتوں کی فہرست کے بارے میں ایک بار پھر وہ رضیہ سلطانہ سے استفسار کرتا ہے ۔ مزید کہتا ہے کہ اگر کوئی آخری خواہش رضیہ سلطانہ کے دِل میں ہے تو بتا دے ، اس پہ ہمدردی سے غور کیا جائے گا ۔ علاوہ ازیں یہ کہ گو اب وقت بُہت کم رہ گیا ہے لیکن کسی مولوی ، کسی عالم دین ، کسی مذہبی راہنما سے رجُوع کرنا چاہے تو اِس سلسلے میں اب بھی کوشش ہو سکتی ہے ۔

2009/08/27 19:55

جواب میں رضیہ سلطانہ کا چُپ کا روزہ ایسے برقرار رہتا ہے گویا کبھی ٹوٹے

گا ہی نہیں ، فقط خالی خالی نظروں سے آدمیوں کو دیکھتی ہے جیسے کہ اُس کے سامنے کوئی اَور ہی زبان بولی جا رہی ہو جس کا ایک ایک لفظ اُس کی سمجھ سے باہر ہو ۔ کرامت علی اَور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سمیت سب لوگ مایُوس ہو کر لوٹ آتے ہیں ۔ ان سب کے دِل بھاری ہیں اور ان میں غُصّے کا اثر ہے ، جیسے کہ خود اُنہوں نے کوئی قصور کیا ہو اَور اس کا جوابدہ ہونا پڑ رہا ہو ۔ یہ منظر آخری دِن کا اِس مقام پہ ختم ہوتا ہے ۔ اِس سے آگے آخری رات شروع ہوتی ہے ۔

آخری رات کی داستان :۔

جب کرامت علی حسبِ دستور رضیہ سلطانہ کو کوٹھڑی کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو حیرانی کے مارے اُس کے اوسان خطا ہونے کو آئے ۔ رضیہ سُلطانہ کوٹھڑی کے دروازے سے لگ کر کھڑی تھی اَور اُس کے لب وا تھے ، گویا آواز کے اِنتظار میں ہو ۔

"کرامت ،" وہ دیکھتے ہی بولی ، "سُپرنٹنڈنٹ سے کہو میں رکھوال کے مولوی احمد شاہ کے سامنے توبہ کرونگی" ۔ سخت تعجب کی حالت میں کرامت علی کے مُنہ سے نِکلا ، "فیروز شاہ کا باپ !" پھر وہ اِنتظار کِئے بغیر اُلٹے پاؤں مُڑا اَور بگٹٹ سُپرنٹنڈنٹ کے دفتر پہنچا ۔

"خود مُنہ سے بولی ہے ؟" اسسٹنٹ سُپرنٹنڈنٹ نے پیغام سُن کر پوچھا ۔

"جی بِالکل ۔" کرامت علی نے اَیسے فخریہ لہجے میں جواب دیا گویا ایک قاصد خوشنودی لے کر کِسی بادشاہ کے دربار میں پہنچا ہو ۔

"دِل سے تو نہیں گھڑی ۔"

"جی بالکل نہیں ۔"

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے سوچتے ہوئے لمبا سا "ہُوں" کِیا ۔ "یہ رکھوال کا مولوی ہے ؟"

"جی ہاں ۔"

"مقتول بھی سارے رکھوال کے ہی تھے نا؟"

"جی سارے رکھوال کے تھے ۔"

"اب اس مولوی کو اِس وقت کہاں سے ڈھونڈیں ، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چڑ کر بولا ۔" بدبخت نے آخری وقت بھی آرام خراب کِیا ۔ مولوی

2009/08/27 19:55

کے ساتھ بھی کسی نہ کسی کی ڈیوٹی لگے گی ۔ پھانسی پر پہلے ہی میری ڈیوٹی ہے ۔ رات برباد گئی ۔ سپرنٹنڈنٹ سے بات کرتا ہوں ۔"

کرامت علی جو اُس وقت تک ضبط کئے کھڑا تھا ، آخر بول اُٹھا ۔ "میں رکھوال کا ہُوں جناب ۔ مولوی احمد شاہ کو جانتا ہوں ۔ آپ بولیں تو جا کر لا سکتا ہُوں ۔"

"تُم رکھوال کے ہو ؟" اسسٹنٹ سُپرنٹنڈنٹ نے پوچھا ۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا ؟"

"سب جانتے ہیں جی ۔ سپرنٹنڈنٹ صاحبؒ کو بھی پتا ہے ۔ آپ نئے آئے ہیں ۔"

"یہ مولوی کون ہے ؟"

"امام مسجد ہیں ۔ ان کے باپ دادا بھی پیش امام تھے ۔ عالم دین ہیں ۔ بڑے نیک بزرگ ہیں ۔"

"مُجرمہ کی ان سے کوئی رشتہ داری ہے ؟"

"جی نہیں ۔"

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پھر سوچ میں پڑ گیا ۔ "اچھا ،" وہ بولا ، "پندرہ منٹ تک آنا ۔ باہر ٹھہرو ۔"

پندرہ منٹ کے بعد کرامت علی پیش ہوا تو اسسٹنٹ صاحب فیصلے کو پہنچ چُکا تھا ۔ اُس نے کرامت علی کو حُکم دیا کہ وہ جیل کی گاڑی لے کر جائے اور احمد شاہ کو لے آئے ، وقت کم ہے ۔

کرامت علی جب گاؤں پہنچا تو احمد شاہ کی کوئی خبر نہ تھی ۔ اُس کی بیوی کو بھی عِلم نہ تھا کہ کہاں پر ہے ۔ سوائے انتظار کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا ۔ احمد شاہ عشاء کے قریب واپس لوٹا ۔ پُوچھنے پر پتا چلا کہ گاؤں سے کُچھ دُور حُسین احمد کے ڈیرے پہ گیا تھا ۔ حُسین احمد کی بیٹی پہ جِنّوں کا سایہ تھا ۔ جب بھی جنّات آکر پکڑتے تھے وہ عربی فارسی میں بولنا اَور پچھاڑیں مارنا شروع کر دیتی تھی ۔ پھر اُس کا باپ ، میاں احمد شاہ کو دم درُود پڑھنے کو بُلا بھیجتا تھا ۔ کرامت علی کو دیکھ کر احمد شاہ بُہت خوش ہوا ۔ پھر اُس نے اپنے بیٹے کو یاد کر کے چند [illegible] چکیں تو وہ کرامت علی کو لے کر نماز

2009/08/27 19:55

پر جانے چلا گیا ۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی کرامت علی نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا ۔ اسے سُن کر احمد شاہ اُچھل پڑا ۔ پہلے تو اُسے کرامت علی کی زبان پہ یقین نہ آیا ۔ احمد شاہ تینوں مقتولوں سے واقف تھا ۔ تینوں کے تینوں نہایت متقی ، پرہیزگار اور پاکباز آدمی تھے اور احمد شاہ کی اُن کے گھرانوں سے ایک زمانے کی جان پہچان رہی تھی ۔ اپنی نیکی اور بزرگی کے باوجود احمد شاہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا ۔ اُس کے مُنہ سے قاتلہ کے لئے بے اختیار گالی نکل گئی ۔ کرامت علی کو ، جس کا دِل اپنے مُردہ دوست کے بھید سے واقف تھا ، یہ سُن کر دُکھ ہوا ، مگر وہ اپنے دِل سے وعدہ کر چُکا تھا کہ احمد شاہ کے سامنے ، کم از کم آج رات کی حد تک ، وہ اِس راز کو فاش نہیں کرے گا ، اِس لئے خاموش رہا ۔ صرف اُس نے اِتنا کہا ۔

"میاں جی ، آپ ہی تو گزرے ہوئے لوگوں کی رُوحوں کے رکھوالے ہیں ۔ اسی لئے وہ آپ کے سامنے توبہ کرنا چاہتی ہے ۔ اللہ کا بھی حکم ہے کہ گناہگار کو موقع دیں ۔" احمد شاہ نے مزید پس و پیش کیا تو کرامت علی بولا کہ یہ حکومتی حکم ہے ، چونکہ وہ ذاتی طور پر احمد شاہ کا جاننے والا ہے اِس لئے خود ہی اُٹھ کر چلا آیا ہے ۔ لیکن اگر ایسی بات ہے تو وہ جیل کی حکومت سے طلبی کا پروانہ بھی لے کر آسکتا ہے ۔ یہ سُن کر احمد شاہ کے پاس کوئی جواب نہ رہا ۔

جب وہ جیل خانے پہنچے تو آدھی رات نکل چکی تھی ۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اپنے دفتر میں بے چین بیٹھا اُن کا انتظار کر رہا تھا ۔ دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا ۔

"آپ رکھوال کے مولوی احمد شاہ ہیں ؟" اُس نے پوچھا ۔

"جی ہاں ،" احمد شاہ نے جواب دیا ۔

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے ایک کاغذ پہ اُس کے دستخط کروائے ، پھر چابیاں کرامت علی کو پکڑاتے ہو بولا ۔ "تمہاری اور مسعودہ خانم کی ڈیوٹی مولوی صاحب کے ساتھ ہوگی ۔ مجھے چار بجے پھر واپس آنا ہے ۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا ۔

کرامت علی اور لیڈی وارڈر مسعودہ خانم احمد شاہ کو اپنے ہمراہ لے کر رضیہ سلطانہ کی کوٹھڑی کو روانہ ہوئے ۔

"یہ دیکھو ،" مسعودہ خانم اپنی کلائی دکھاتے ہوئے بولی ، جس پہ ایک لمبی سُرخ

2009/08/27 19:56

خراش کا تازہ نشان تھا ۔ "نہ نہلانے دیتی ہے نہ کپڑے بدلنے دیتی ہے ۔ سوزنی کی طرح حملہ کرتی ہے ۔" ۔

رضیہ سلطانہ اور احمد شاہ کا آمنا سامنا :۔

پیر کرامت علی شاہ چھوٹی سی بیٹھی ہوئی آواز میں ، اپنے لفظوں کے اندر تیز تیز یہ قصہ بیان کر چکے تو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے ۔ معلوم ہوتا تھا وہ یک وقت اِس بات سے پیچھا چھڑانا اور اسے تفصیل سے بیان بھی کرنا چاہتے ہیں ۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے متعدد بار وہ واقعات کو گڈ مڈ ، کرداروں کو آگے پیچھے اور صیغوں کو اُوپر نیچے کر گئے تھے ۔ جب دیوار سے ٹیک لگا کر اُنہوں نے ڈرتے ڈرتے اُوپر دیکھا تو اُن کی گھبراہٹ قدرے ختم ہوئی ۔ سلامت علی کی آنکھوں سے سلامت کے آثار ابھی چھٹے نہ تھے ، مگر اب اُس کے چہرے سے اشتیاق نمایاں تھا ۔ وہ آگے جُھک کر بیٹھا بغور سُن رہا تھا ، جیسے قصے کی تہوں میں اُترتا جا رہا ہو ۔ یہ دیکھ کر پیر کرامت علی کو اپنے اندر کچھ قوت کا احساس ازسرِنو پیدا ہوتا محسوس ہوا ۔ اِس سارے قصے سے بچ نکلنے کا اُنہیں اب ایک راستہ نظر آنے لگا تھا ۔ وہ راستہ یہ تھا کہ اسے ختم کرنے کی بجائے پوری تفصیل سے بیان کیا جائے ، تاکہ جہاں تک ممکن ہو سلامت علی اپنے اشتیاق کے اندر قصے کے راز و رموز میں گم ہو جائے ، کسی دوسرے زمانوں اور دوسرے لوگوں کے حالات میں اُلجھا رہے اور پیر کرامت علی کو اپنے بیٹے کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔ یہ بھرے طوفان کے اندر ٹلک ٹوئیاں مارنے والی بات تھی ، مگر فرار کی کوئی دوسری صورت اُس وقت اُن کی نظر میں نہ آ رہی تھی ۔ چنانچہ وہ دوبارہ ہمت باندھ کر گویا ہوئے ۔ اب اُنہوں نے یہ کہانی اس طرح بیان کرنی شروع کی جیسے کہ کل ہی کی بات ہو ، جس کے چھوٹے سے چھوٹے نقش کی اُن کے ذہن پہ تازہ چھاپ پڑی ہو ۔

"معاف کیجئے گا ،" رضیہ سلطانہ ادب سے بولی ، "میں نے آپ کو تکلیف دی ۔ تشریف رکھیئے ۔"

میاں احمد شاہ کے لئے مسعودہ خانم ایک لکڑی کی چوکی لے آئی تھی ۔ احمد شاہ اُس پہ بیٹھ گیا ۔ کوٹھڑی میں ہلکی ہلکی فضلے کی سڑاند تھی ۔ میاں احمد شاہ نے کنکھیوں سے چاروں [illegible] پونچھ کر اُسے ناک کے آگے رکھ

2009/08/27 19:56

لیا ۔ رضیہ سلطانہ اُس کے سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئی ۔ احمد شاہ پر نظریں جما کر اُس نے بات شروع کی ۔

"میں آپ کے روبرو اپنے جُرم کا اقبال کرنا چاہتی ہُوں ۔ تین مردوں کو میں نے قتل کیا ہے ۔ میں ان کے احوال بتانا چاہتی ہُوں ۔ اجازت ہو تو بتاؤں"

احمد شاہ جس کے لئے زندگی میں یہ پہلا ایسا موقع تھا ، گھبراہٹ سے بولا ۔ "ٹھیک ہے ۔ اپنے من کی بات کہو ۔"

"آپ کو تو پتا ہی ہے ، مُراد ایک غریب کھیت مزدور تھا ،" رضیہ سلطانہ نے بیان کرنا شروع کیا ۔ "اور علی محمد گاؤں کا ترکھان تھا ۔ دونوں سیدھے سادے دیہاتی تھے ۔ اُن کو ہلاک کرنا اِس لئے بھی آسان تھا کہ دونوں نوجوان تھے ۔ مُراد سب سے زیادہ خوش شکل تھا ۔ علی محمد کے مُنہ پر ماتا کے داغ تھے مگر وہ بھی چوڑا چکلا مضبوط جوان تھا ۔ ان دونوں کا پیچھا کرتی ہوئی میں ہر روز دیہاتی عورت کا بھیس بنا کر ، کمر میں تہمد باندھ کر ، کُرتہ پہن کر اور موٹا دوپٹہ اوڑھ کر رکھوال جایا کرتی تھی ۔ اِس سے مجھے چند روز میں اُن کے کام کاج کے اوقات کا پتا چل گیا ۔

"مُراد کا کام تمام کرنا سب سے آسان نِکلا ۔ اُس کو میں نے کھیتوں میں جا لیا ۔ مجھے عِلم ہو چُکا تھا کہ دوپہر کے وقت وہ صُبح کا کام ختم کر کے درختوں کے ایک چھوٹے سے جُھنڈ میں جاتا ہے اور وہاں وہ اپنی پوٹلی کھول کر اچار سے یا چٹنی سے روٹی کھاتا ہے ۔ کھانے کے بعد وہ اپنی گڑوی کے مُنہ پہ بندھا ہوا کپڑا کھولتا ہے اور لسی کے گھونٹ بھرتا ہے ۔ کھانے پینے کا کام ختم کر کے وہ اُٹھ کر پیشاب کرتا ہے اور پھر ایک درخت کی جڑ کے پاس لیٹ کر گھنٹہ دو ستایا کرتا ہے ۔ یہ اُس کا روزانہ کا معمول تھا ۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں وقت تک انتظار کروں جب تک کہ اُس کی آنکھ نہ لگ جائے اُس روز جب کھیتوں میں کام کر رہا تھا تو میں اُس جُھنڈ میں جا کر چُھپ گئی عین وقت مُراد اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور پوٹلی کھول کر روٹی کھانے لگا میں اُس سے دس بارہ فُٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی ۔ وہ روٹی چبا چبا کر کھا رہا تھا اور مجھے اُس کی جبڑے کی مچھلیاں اُبھرتی اور ڈوبتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں ۔ کھا چکنے

2009/08/27 21:59

بعد اُس نے خالی کپڑا سر کے گرد لپیٹ کر باندھ لیا اور گڑوی کا مُنہ کھول کر لسی پینے لگا ۔ جب اُس کی پیاس بُجھ چکی تو اُس نے اُٹھ کر پیشاب کیا ۔ وہ ہمیشہ ایک ہی درخت کی جڑ میں پیشاب کیا کرتا تھا ، اور میں نے دیکھا تھا کہ ہر روز وہ اُس جڑ کی ایک ہی موری کے اندر پیشاب کی دھار مارتا تھا ۔ یہ اُس کی عادت تھی ۔ پیشاب کی حاجت سے فارغ ہو کر وہ اگر اپنی جگہ پر لیٹ گیا اور گڑوی کا تکیہ بنا کر ستانے لگا ۔ کچھ دیر تک اُس نے آنکھیں بند رکھیں ۔ مگر پھر اُس نے کروٹ بدلی ۔ وہ پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا ، بدل کر سیدھا پُشت پر دراز ہوگیا اور آنکھیں کھول کر اُوپر درخت کی ٹہنیوں میں دیکھنے لگا ۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے مُنہ کھولا اور ماہیئے کے کچھ بول بولنے شروع کر دیئے ۔ میں نے چند منٹ اور انتظار کیا ، مگر وہ سونے کی بجائے اُٹھ کر ایک بار پھر پیشاب والے درخت کے پاس پہنچا ۔ وہاں اُس نے مخصوص موری کے اندر مختصر سی دھار ماری اور اپنی رانوں کو مَلتا ہوا واپس آکر دوبارہ گڑوی کے مُنہ پر سر جما کر لیٹ گیا اور ماہیا گانے لگا ۔ مَیں نے پہلی بار اُسے گاتے ہوئے سُنا تھا ۔ اُس کی آواز اُسی کی طرح مہین اور نرم و نازک تھی اور گاتے ہوئے اُس کے گلے میں ہلکی سی کپکپاہٹ پیدا ہو رہی تھی ۔ میں چُھپ کر کھڑی دیکھتی رہی ۔ مُراد نے ماہیا چھوڑ کر ایک عشقیہ گانے کے بول شروع کر دیے ۔ میرے دِل میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی ۔ مگر مُراد کے اندر اُس دن نہ جانے کیسا طوفان آیا تھا ، سونے کا نام نہ لے رہا تھا ، آنکھیں کھولے پڑا گاتا جا رہا تھا اور ہاتھ رانوں میں دیئے مَلتا جاتا تھا ۔ وقت گزرتا جا رہا تھا ۔ میرے دِل میں ملال آرہا تھا کہ میں نے غلط دِن کا انتخاب کیا ہے ۔ ایک خیال مجھے یہ بھی آیا کہ میں اِس موقعہ کو اگلے دن تک ملتوی کر دوں ۔ مگر میرے سر میں جو جنوں تھا وہ مجھے چین نہ لینے دیتا تھا ۔ ایک گھنٹے سے زیادہ گزر چُکا تھا ۔ آخر تنگ آکر میں جہاں پہ کھڑی تھی وہیں پہ لیٹ گئی ۔ لیٹ کر میں نے زمین پہ گِرے پتّوں اور ٹہنیوں کو اکٹھا کر کچھ کھڑکایا ۔ آواز سُن کر مُراد نے سر اُٹھایا ، اِدھر اُدھر دیکھا ، پھر سر کو زمین پہ رکھ کر پہلو کے بل لیٹ گیا ۔ اُس نے گانا بند کر دیا تھا ۔ میں نے کچھ اور ہاتھ پاؤں ہلائے ۔ اس سے جو شور پیدا ہوا اُس نے شُبہے کی گنجائش نہ چھوڑی ۔ اب مُراد اُٹھ کھڑا ہوا ۔ وہ نظریں جما کر اُس جگہ کی جانب بڑھا جہاں میں لیٹی تھی ۔ میری کمر میں جو تہمد بندھا تھا اُس کا ایک پلّو میں نے ایک طرف سے اُڑس دیا ،

2009/08/27 22:00

جس سے میری ایک ٹانگ اُوپر تک ننگی ہوگئی ۔ پھر میں آنکھیں میچ کر سیدھی لیٹ گئی ، جیسے گہری نیند سو رہی ہوں ۔ میری آنکھیں بند تھیں ، مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرے اُوپر کھڑا ہے ۔ مجھے اُس کی سانس کی آواز تک سنائی دے رہی تھی ۔ دو تین مِنٹ کے بعد جب مجھے یقین ہوگیا کہ اُس کی نظریں میرے چہرے سے گزر کر میری ران پر جمی ہونگی ، میں نے ایک آنکھ ذرا سی کھولی ۔ وہ اب گھٹنے زمین پہ ٹیکے ، ہاتھوں کے بل جُھک جُھک کر میرے تہمد کی سِلوٹوں کے اندر جھانک رہا تھا ۔ اُس کی صورت ایسی تھی کہ اگر میرے دِل میں آگ نہ بھری ہوتی تو میری ہنسی نِکل جاتی ۔ یکایک میں نے دیکھا کہ اُس نے اپنی اُبھری ہوئی دھوتی کے بل کھولے اور اُسے الگ کر دیا ۔ اُس کے چہرے پہ ہیجان کی کیفیت دیکھ کر مجھے پتا چل گیا کہ اب وہ کیا کرنے والا ہے ۔ مگر اِس سے پہلے کہ وہ کُود کر میرے اُوپر سوار ہو جاتا ، میں اُچھل کر اُس کی زد سے باہر ہوگئی ۔ وہ ایک لحظہ حیرت سے گُم سُم ہوئے بیٹھا رہا ، پھر اُٹھ کر میرے پیچھے دَوڑ پڑا ۔ اُس کے آگے بھاگتی ہوئی میں اُس درخت تک پہنچ گئی جو اُس کے لیٹنے کی جگہ تھی ۔ وہاں پہنچتے ہی بجلی کی تیزی سے ایک خیال میرے دِماغ میں آیا کہ یہی بہترین موقع ہے ، اب جب کہ وہ خواہش کے مارے پاگل ہوا جاتا ہے اور کُودتا ہوا آرہا ہے ، اب وہ پُورے کا پورا وار سہے گا ۔ میرے ڈب میں اوزار بندھا تھا ، مگر مجھے اُس کی دراتی گڑوی کے پاس پڑی دکھائی دی ۔ میں نے اُس وقت وُہی اُٹھا لی ۔ مُڑ کر دیکھا تو وہ تگڑے بدن اپنی مردانگی کا پھل اُٹھائے دوڑتا ہوا میرے سر پہ پہنچ چُکا تھا ۔ اُس وقت وہ مجھے ایک پتلے دُبلے نوجوان کی بجائے ایک ایسے ہاتھی کی مانند دکھائی دیا جو سُونڈ اُٹھائے چڑھا آرہا ہو ۔ اُس نے جو ایک آخری چھلانگ لگا کر مجھے دبوچ لینا چاہا تو میں نے دراتی کا دندانے دار پھل اُس کی ٹانگوں کے بیچ چڑھا دیا ، پھر دونوں ہاتھوں سے دستے کو پکڑ کر جو اُسے اُوپر کو کھینچا تو آدھے پیٹ تک چیرتا ہوا چلا گیا ۔ خون کا فوارہ چھوٹ پڑا اور اُس کے عُضو کٹ کر ایک ایک نس سے لٹکنے لگے ۔ وہ اپنے پیروں سے ایک چھوٹی سی ہولناک آواز نِکلی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے صرف کو تھام لیا ۔ اُس وقت اُس کے چہرے پہ دُکھ درد کی کوئی علامت نہ تھی ، صرف ایک حیرانگی کا تاثر تھا ۔ جیسے ہی وہ زمین پہ گرا میں نے دراتی اُس کی گردن میں ڈال دی ۔ دراتی اُس کی گردن کے گِرد ایسی فِٹ آئی جیسے بنی ہی اس مقصد

2009/08/27 22:00

کے لئے ہو ، ایک ہی جھٹکے سے میں نے اُس کا گلا کاٹ دیا ۔ پھر میں نے دراتی کو گڑوی کے پاس پڑے ہوئے کپڑے سے صاف کیا اور وہاں سے چل پڑی ۔ واپسی پر میں نے دراتی کو گیہوں کے کھیت میں دبا دیا ۔ میرا تہمد اور کُرتا جگہ جگہ پہ خون سے تر ہو چکے تھے ۔ مَیں نے تہمد کھولا اور اُلٹا کر اُسے باندھا ۔ پھر مَیں نے چادر میں اپنے آپ کو لپیٹ لیا ۔ وہاں سے پھر مَیں تانگہ لے کر سیدھی شہر اپنے گھر کو چلی آئی" ۔ رضیہ سلطانہ واقعہ سُنا کر سانس لینے کو رُکی تو احمد شاہ ، جو چار خانہ رومال ناک پہ رکھے ، چہرے پہ سخت ناگواری اور صدمے کے آثار لئے بیٹھا تھا اور جس نے دو ایک بار بات کو بیچ میں ٹوکنے کے لئے مُنہ کھولا تھا مگر رضیہ سلطانہ کی آواز کے آگے دب کر رہ گیا تھا ، بڑبڑا اُٹھا ،

"یہ باتیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں لڑکی ، خدا کے حضور توبہ کرنا اور گناہوں کی معافی مانگنا ہی کافی ہے ۔"

"میاں جی ،" رضیہ سلطانہ بولی ، "میں نے پہلے عرض کی تھی ، جب تک میں اپنے سارے جُرموں کے احوال بتا نہیں لیتی میرا اقبال نہیں ہوگا ۔ یہ احوال بیان کر کے ہی اور اِس دوزخ سے دوبارہ گزر کر ہی میں اپنے وجود سے گناہوں کی سیاہی کو دھو سکتی ہُوں ۔ میری آخری رات ہے میاں جی ، پروردگار کے لئے مجھے رد نہ کیجئے ۔ میری بات سُن لیجئے ۔"

"احمد شاہ ماتھے پہ تیوری ڈالے ناگواری سے اُسے دیکھتا رہا ۔ کوٹھڑی میں گوسٹرائد اِتنی ہلکی تھی کہ ایک بار تعفنوں میں بس گئی تو محسوس نہ ہوتی تھی ، مگر احمد شاہ اُسی طرح رومال ناک کے آگے رکھے بیٹھا تھا ، گویا اپنے آپ کو رضیہ سلطانہ کے جراثیم سے ڈھک کر رکھنا چاہتا ہو ۔

"گھر سے کپڑے تبدیل کر کے ،" رضیہ سلطانہ بولی ، "مَیں نے سیدھا علی محمد کی دکان کا رُخ کیا ۔ انہی چند مہینوں میں جب مَیں ان دونوں کا پیچھا کر رہی تھی ، میں علی محمد کے ساتھ بھی کاروباری طور پہ واقفیت حاصل کر رہی تھی ۔ اُس کی گاؤں میں ترکھان کی دوکان تھی ۔ مَیں نے اُسے بتا رکھا تھا کہ میں چک اٹھاسی کی زمیندارنی ہوں ، اور اُس کے پیرمغوں کی مشہوری سُن کر آئی ہُوں ۔ یہ بات سُن کر وہ فخر سے پھُول گیا ۔ مَیں نے اُس سے کہا کہ میرے لئے وہ خاص عمدہ قسم کے چار [illegible] کی پرواہ نہ کرے ، جتنی لاگت بھی

2009/08/27 22:00

آنے میں دینے کے لئے تیار ہوں ، مگر یہ خیال رکھئے کہ پیڑھے ایسے ہوں جن کی بناوٹ اور روغن اور نقش و نگار کی مثال علاقے بھر میں نہ ملتی ہو ۔ یہ کہہ کر میں نے ایک سو روپے کا نوٹ پیشگی رقم کے طور پر اس کے آگے رکھ دیا ۔ اتنے پیسے دیکھ کر علی محمد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نوٹ اٹھا کر اپنی چٹائی کے نیچے سرکا دیا ۔ ساتھ ہی میں نے ایسی آنکھیں مٹکائیں کہ وہ وہیں پہ میرا گرویدہ ہوگیا ۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اٹھاسی کے بڑے زمیندار کی بہو ہوں ، اور میرا خاوند فوج میں لفٹین ہے جو بنگال گیا ہوا ہے ۔ علی محمد کی عجیب حالت تھی ۔ اس کی نظریں میرے اوپر سے نہ ہٹتی تھیں ۔ وہ مجھ سے کچھ مرعوب ، کچھ متاثر ، اور کچھ مبتلائے عشق نظر آرہا تھا ۔ میں کامیابی سے اپنا پہلا وار کر کے چلی آئی ۔ اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں اسی بہانے وہاں پہنچ جاتی کہ دیکھوں علی محمد نے میرے پیڑھوں کا کام شروع کر رکھا ہے یا نہیں ۔ وہاں بیٹھ کر میں اس کے ساتھ دنیا بھر کی باتیں کرتی اور گھنٹہ گھنٹہ بھر بیٹھی رہتی ۔ ہر بار جب جاتی تو اس کے قریب سے قریب تر ہو کر بیٹھتی ، اور کوئی مذاق کی بات بیچ میں آجاتی تو اسے ہولے سے ایک دھپ رسید کر دیتی ۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے ساتھ رازدارانہ طور پر گفتگو کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا تھا ، جس کے دوران میں کبھی اس کے کندھے ، کبھی بازو اور کبھی سینے کو ہاتھ سے چھو دیتی تھی ۔ اب علی محمد نے بہت سا کام چھوڑ کر میرے پیڑھے بنانے شروع کر رکھے تھے اور دن رات انہی کی محنت پر لگا رہتا تھا ۔ جب میں رخصت ہونے کیلئے اٹھتی تو پوچھتا کہ اب میں کب اس کی دوکان پر آؤنگی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر دم میرے انتظار میں رہتا تھا ۔ دوکان اس کے گھر سے ملی ہوئی تھی ۔ بیچ میں ایک در تھا جو بند رہتا تھا ۔ دروازے کے اس طرف عورتوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں ۔ پوچھنے پر علی محمد نے بتایا کہ اس کی بوڑھی ماں اور اس کی بیوی گھر میں تھیں ۔ اس کی شادی کو ابھی چھ ماہ کا عرصہ ہی گزرا تھا ، اور اس کی بیوی حاملہ تھی ۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علی محمد میری زلف کا اسیر ہو چکا تھا ۔ اسی عرصے میں میں نے پتا لگا لیا تھا کہ دوپہر سے لے کر پانچ بجے تک اس کی دوکان تقریباً خالی ہوتی تھی ۔ صبح کے وقت اس کے پاس کاریگر یا کوئی ملنے والے آبیٹھتے تھے ۔ مگر ظہر سے لے کر عصر کے بعد تک وہ اکیلا ہی

2009/08/27 22:01

دوکان میں کام کرتا رہتا تھا ۔ خاص طور پر مَیں نے دیکھا تھا کہ جب بھی مَیں اُس کے پاس بیٹھی ہوتی تھی ، کوئی ایک آدھ آنکلتا تو باہر سے ہی دیکھ کر چلا جایا کرتا تھا ۔ دوکان کے یہ اوقات اتفاق سے میرے مقصد کے لئے عین موزوں تھے ۔ اُس روز مَیں گھر سے کپڑے بدل کر واپس رکھوال پہنچی تو عصر کا وقت ہو چلا تھا ۔ میرے دِل میں خدشہ تھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے ۔ مجھے پکڑے جانے کی فِکر نہ تھی ، صرف اِس بات کا اندیشہ تھا کہ ابھی میرا کام نصف بھی مکمل نہ ہوا تھا ۔

خوش قِسمتی سے گرمیوں کے دن شروع ہو چکے تھے ۔ گاؤں کی گلیوں میں اکا دُکا لوگ ہی چل پھر رہے تھے ۔ مَیں نے چادر اپنے گِرد اِس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ جِسم اَور سر اَور نِصف چہرہ پورے طور پر ڈھکے ہوئے تھے ۔ چادر تلے میں نے سفید ململ کا چولا پہن رکھا تھا جِس کے نیچے شمیز یا انگی کچھ بھی نہ تھی ۔ مُنہ نیچا کئے تیز تیز چلتی مَیں علی محمد کی دوکان پر پہنچی ۔ دروازے کا ایک پٹ ہمیشہ بھڑا رہتا تھا ۔ اِس وقت دوسرا بھی دُھوپ سے بچنے کی خاطر آدھا بند تھا ۔ حسبِ اُمید علی محمد اکیلا اندر بیٹھا تھا ۔ یہ سب سے اچھی بات تھی جو میرے حق میں ہوئی تھی ۔ اُس وقت اگر کوئی اُس کے پاس موجود ہوتا اور مجھے آتے ہوئے دیکھ لیتا تو میرے لئے مُشکل پیدا ہو جاتی ۔ علی محمد جِسم سے ننگا ، صرف ایک دھوتی باندھے ہوئے تھا اَور اُس کے سِینے پر پسینے کی دھاریاں چل رہی تھیں ۔ مَیں نے دوکان میں داخل ہوتے ہی دوسرا پٹ بھی بند کر دیا ۔ اُف ، مَیں بولی ، کیسی غضب کی گرمی پڑ رہی ہے ، اَور چادر اُتار کر الگ رکھ دی ۔ علی محمد نے جو باریک چولے کے اندر میرا بدن دیکھا تو اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں ۔ دوکان میں اب روشنی صرف ایک چھوٹی سی چوکور کھڑکی کے راستے آرہی تھی جو دیوار میں ذرا اونچائی پہ لگی تھی اَور روشندان کا کام بھی دیتی تھی ۔ علی محمد نے دو پیڑھے تیار کر رکھے تھے جو اُس کے پہلو میں پڑے تھے ۔ مَیں جا کر ایک پیڑھے پر بیٹھ گئی ۔ اب میں اِس صورت میں تھی کہ اُس کے بہت قریب بیٹھی تھی ، یُوں کہ میرے گھٹنے اُس کے بازو سے مِلے ہوئے اَور وہ گردن موڑ کر مُتواتر مجھے اَور چولے کے اندر میرے سِینے کو دیکھے جا رہا تھا ، گویا کسی جادو کے اثر میں ہو ۔ اُس کا چہرہ فرطِ جذبات سے مغلُوب ہو رہا تھا اَور اُسے پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے اَور کیا نہ کرے ۔ اُس کے ہاتھ میں

2009/08/27 22:01

کپکپاہٹ پیدا ہو رہی تھی ۔ وہ ایک تندرست بدن کا نوجوان تھا جس کے بازوؤں کے پٹھے مچھلیوں کی مانند تڑپتے تھے اور پیٹ کی سلوٹیں باریک رسیوں کی مانند تھیں گویا چربی کی ایک رتی اُن کے اندر نہ ہو ۔ پسینہ اُس کے جسم پہ پانی کی طرح بہ رہا تھا اور اُس کی نظریں بار بار میرے بدن سے اُچک کر دروازے کی جانب جاتی تھیں اور پھر واپس میرے اُوپر مرکوز ہو جاتی تھیں ۔ مَیں کچھ اور آگے جُھک کر بیٹھ گئی جس سے میرے چولے کا گلا ڈھلک آیا ۔ علی محمد کی نظریں اب چولے کے اندر سے سیدھی میری چھاتیوں پر پڑ رہی تھیں ۔ وہ ایسے انداز سے بیٹھا تھا کہ اُس کی دھوتی ایک جگہ سے اُلٹ گئی تھی جہاں سے مَیں اُس کی ران کے تنے ہوئے پٹھوں کو دیکھ سکتی تھی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ دھوتی کے اندر اُس کے پٹھے آہستہ آہستہ پھیلتے جا رہے ہیں ۔ علی محمد کو اپنی کچھ خبر نہ تھی ۔ وہ مجھے پیڑھے دکھانے بھی بُھول چُکا تھا ۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھے جا رہا تھا ۔ وقت نِکلتا جا رہا تھا ۔ مجھے پتا تھا کہ ابھی ظُہر کی اذان ہوگی اور پھر لوگوں کی چہل پہل شروع ہو جائے گی ۔ مَیں مزید وقت ضائع نہ کرنا چاہتی تھی ۔ اُسی وقت وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا ۔ وہ عظیم الجثہ آدمی مجھے ایک ایسے انجن کی مانند لگا جو شنٹ کرتا ہوا میرے سر پہ چڑھ آیا تھا ۔ نظر بچا کر میں نے ڈب سے چاقو نِکالا اور تیزی سے اُس کے پیٹ میں گھونپ دیا ۔ ایک تجربہ مجھے پہلے ہو چُکا تھا ، لہٰذا اِس بار خون کے چھینٹے میں نے اپنے اُوپر نہ پڑنے دیے ۔ دستے کو گرفت میں رکھتے ہوئے میں پہلو بدل کر علی محمد کی پُشت کی جانب جا کھڑی ہوئی ۔ علی محمد نے سر موڑ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی ، اور اُس وقت میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں پھر گئی ہیں ۔ پیٹ کو پکڑے پکڑے وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ آرہا ۔ ایک بار اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر پہلو کے بل گر گیا ۔ مَیں نے یکے بعد دِیگرے دو تین چاقو کے وار کیے ۔ ایک بار میرا ہاتھ خون اور پسینے کی وجہ سے پھسل گیا ، مگر دو بار میں نے [illegible] کا پھل اُس کی پسلیوں کے بیچ اندر تک اُتار دیا ۔

علی محمد نے زمین پہ پڑے پڑے مُنہ سے ایسی آواز نِکالی جیسے [illegible] بھونک مارتا ہے ۔ میں نے چٹائی سے اُس کی قمیض اُٹھا کر اُس کے مُنہ پہ دبا دی جس سے اُس کی آواز رُک گئی ۔ کچھ دیر کے بعد جب اُس کا جسم بے حرکت ہوگیا ، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور مُنہ سے خون جاری ہونے لگا تو میں نے اُسی کی

2009/08/27 22:01

قمیض سے چاقو پونچھ کر صاف کیا ، اور قمیض دوبارہ اُس کے مُنہ پر دبا دی ۔ پھر میں نے چادر اپنے گرد لپیٹ لی ۔ میرے کپڑوں پر اِس بار صرف چند ہی چھینٹے خون کے پڑے تھے ، جنہیں میں نے بآسانی چادر کے اندر چُھپا لیا ۔ صرف میرے ہاتھ تھے جو خون میں لتھڑے تھے ۔ اُنہیں میں نے چادر کے نیچے ڈھکے رکھا ۔ نکلنے سے پہلے میں نے ایک نظر پیڑھوں پر ڈالی ۔ اَیسے خوبصورت پیڑھے میں نے کبھی نہ دیکھے تھے ۔ علی محمد نے اپنی ساری محبت کا زور اُس کاریگری پہ لگا دیا تھا ۔ دوکان سے نکل کر مَیں نے دروازہ بند کیا اَور جاتے جاتے باہر سے اُس کی کُنڈی لگا دی ۔ تانگے والے کو پیسے دیتے ہوئے مجھے دِقّت کا سامنا کرنا پڑا ، مگر کسی نہ کسی طرح چادر کے اندر سے ہی میں نے نقدی اُسے پکڑا دی ۔ اِس طرح شام ہونے تک میں گھر پہنچ گئی" ۔

احمد شاہ کی پریشانی اب برہمی کی حالت کو پہنچ چکی تھی ۔ اُسے موقع مِلا تو بولا ۔ "یہ کیسی بک بک لگا رکھی ہے ۔ اَیسی لچر باتوں کو دُہرا کر بخشش مانگتی ہو ؟ اپنی آخرت تباہ کر رہی ہو ، ساتھ میرا ایمان بھی خراب کرتی ہو ۔ اگر کچھ بتانا ہی ہے تو یہ بتا کہ تُو نے یہ اقدام کِس واسطے کئے ؟"

"بخشش کا کِسے عِلم ہے میاں جی ،" رضیہ سلطانہ بولی ، "وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ مَیں تو صرف اپنے بدن سے اس زہر کو دھونا چاہتی ہُوں ۔ اب آخری حال بیان کرنا رہ گیا ہے ، وہ بھی سُن لیں ۔ اس کے بعد میری جان آسانی سے نکلے گی ۔ اللہ آپ کو اِس کی جزا دے گا ۔"

"بول ، بول ، ختم کر اِس گندی کہانی کو ۔ یہ بتا کہ کِس وجہ سے تُو نے بے گناہوں کی جان لی ؟"

"بہت اچھا ، میاں جی ،" رضیہ سلطانہ نے اِلتجا کی ، "جلدی ختم کر دوں گی ۔ اللہ صبر کی تلقین کرتا ہے ۔ مَیں نے بہت صبر کیا ہے ۔ اب آپ کچھ صبر کر لیں ۔ خُدا اجر دے گا ۔ بس ایک آدمی کا حال بیان کرنا رہ گیا ہے آپ کو تو علم ہی ہے ، اُس کا نام چوہدری اکرم تھا ۔ چوہدری اکرم تیسرا آدمی تھا ۔ اُس کے پیچھے مجھے سب سے بڑی مُشکل کا سامنا کرنا پڑا ۔ تاہم اُس کا کام سب سے زیادہ آسانی سے تمام ہوا ۔ مُشکل یہ پڑی کہ وہ جہلم کی ایک کپڑے کی مِل میں کام کرتا تھا ، چھٹی پر گاؤں آیا ہوا تھا ، چند دِن کے بعد یہ واپس کو لے کر واپس نوکری پر چلا گیا ۔ اُس کا پتا لگانے میں مجھے کافی عرصہ لگ گیا

2009/08/27 22:01

تھا ، مگر آخر علی محمد کے ذریعے ہی بہانے بہانے سے مَیں اُس کا پتا نِکال چکی تھی ۔ اُس روز مَیں علی محمد سے فارغ ہو کر گھر پہنچی تو رات کو ریل گاڑی پر سوار ہو کر جہلم کو روانہ ہوگئی ۔ رات کا آخری حِصّہ مَیں نے ویٹنگ روم میں گزارا ۔ صُبح سویرے تانگہ لے کر شہر سے ایک مِیل دُور کپڑے کی مِل پہنچی ۔ سب سے بڑی مُشکل یہ تھی کہ مجھے چوہدری اکرم کے گھر کا پتا معلوم نہ ہو سکا تھا ۔ صرف یہاں تک عِلم ہوا تھا کہ وہ مُستقل رات کی شِفٹ پر کام کرتا ہے ۔ چُنانچہ مجھ کو مِل کے باہر ہی پہنچ کر اُس سے مڈھ بھیڑ کرنا تھی ، اَور کوئی راستہ نہ تھا ۔ مَیں صُبح کے پانچ بجے مِل کے دروازے کے سامنے جا کر سڑک کی دوسری طرف کھڑی ہوگئی ۔ وہاں پہ دو تین دوکانیں تھیں جو ابھی کھلی نہ تھیں ۔ کچھ دیر کے بعد مَیں ایک دوکان کے سامنے پڑے ہوئے بینچ پر جا بیٹھی ۔ جب چھ بجے کا ہُوٹر ہوا تو رات کی شِفٹ کے لوگ مِل سے نِکلنا شروع ہوئے ۔ چائے اَور بیکری کی ایک دوکان بھی کھل گئی تھی ۔ کچھ لوگ وہاں جمع ہو کر چائے کی پیالیاں پینے لگے ، کچھ ڈبل روٹیاں ، بند اَور رس خرید کر گھروں کو روانہ ہوئے ۔ مَیں مِل سے نِکلتے ہوئے ایک ایک ورکر کے چہرے کو دیکھ رہی تھی ۔ آخر ایک چھوٹے سے ٹولے میں مجھے چوہدری اکرم کا چہرہ نظر آگیا ۔ اُس نے ہاتھ میں پیتل کا ٹِفن کیریئر اُٹھایا ہوا تھا ۔ وہ اپنے ٹولے کے چند لوگوں کے ہمراہ جا کر بس سٹاپ پر ٹھہر گیا ۔ وہاں پہ وہ چند آدمی بس کا اِنتظار کرنے لگے ، باقی کے سلام دُعا لے کر گھروں کو چل دیے ۔ چوہدری اکرم کے واسطے مَیں نے پہلے سے سکیم تیار کر رکھی تھی ۔ مجھے عِلم تھا کہ وہ چالیس سالہ مُتقی پرہیزگار اَور بیوی بچوں والا آدمی تھا ، اُس کے ساتھ پُرانے ہتھکنڈے نہ چلیں گے ۔ مزید وقت ضائع کئے بغیر مَیں اُس کے پاس پہنچی ۔ اُسے مخاطب کر کے مَیں نے کہا کہ میں چک اٹھاسی کی رہنے والی ہُوں اَور سرائے عالمگیر کِسی کام سے آئی ۔ آج وہاں سے جہلم کے اڈّے کی طرف آرہی تھی تاکہ بس لے کر واپس گھر جاؤں ۔ صُبح سویرے کوئی سواری نہ مِل سکی اِس لئے پیدل ہی چل کر پُل پار کر رہی تھی کہ میرا سات سال کا بچہ دوڑتے دوڑتے ٹھوکر کھا کر گِر پڑا ۔ اُس کا سر کِسی کے جنگلے سے لگ کر پھٹ گیا ۔ مَیں نے روتے روتے چادر پھاڑ کر اُس کا سر بند کیا ، مگر وہ تقریباً بیہوشی کی حالت میں تھا ، اَور اُسے اُٹھا کر چلنے جوگے اندر ہمت نہ تھی ۔ کاروں بسوں کو ہاتھ دیے ، کِسی نے نہ روکا ۔ بچے کو

2009/08/27 22:02

وہیں چھوڑ کر بھاگتی ہوئی اڈے پر آئی ، بازار میں دُہائی دی ۔ فجر کا وقت تھا ، لوگ سوئے پڑے تھے ، کوئی کوئی آدمی دکھائی دیتا تھا ۔ پوچھنے کو آتے تھے ، مگر ساتھ چلنے کو کوئی رضامند نہ ہوتا ۔ خوش قسمتی سے مجھے آپ کا خیال آگیا ۔ رکھوال میں میری رشتے داری ہے ، مَیں نے سُن رکھا تھا کہ چوہدری اکرم یہاں کپڑے کی مِل میں کام کرتے ہیں ۔ مَیں سیدھی یہاں چلی آئی ہُوں ۔ آپ سے مدد کی بھیک مانگتی ہُوں ، میرے بچے کی جان بچا لیجئے ۔

میری داستان سُن کر چوہدری اکرم نے شک کی نظروں سے مُجھے دیکھا ۔ اگر وہ غور کرتا تو میری کہانی کے سقم اُسے نظر آجاتے ، مگر مجھے ایسا واویلا کرتے دیکھ کر اُس کا دِل پسیج گیا ۔ آخر مَیں اُس کے علاقے کی عورت تھی ، اُس کے آگے ہاتھ پھیلا رہی تھی ۔ اُس کے ساتھ والے لوگوں نے بھی کہنا سُننا شروع کر دیا تھا ۔ چند منٹ کے بعد وہ ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا ۔ اُسی وقت بس آگئی ۔ ہم بس میں سوار ہوگئے ۔ بس کا آخری سٹاپ پُل کے اِس کنارے پر تھا ۔ وہاں سے اُتر کر ہم پیدل پُل پر چل نکلے ۔ اِس سارے عرصے میں مَیں نے اپنی چادر اِس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ جسم کے علاوہ سَر اَور مُنہ بھی ڈھکا ہوا تھا ۔ صرف میری آنکھیں ننگی تھیں ۔ ہم جیسے ہی پُل پہ چڑھے مَیں نے چادر کے بَل ڈھیلے کئے اَور چہرہ ننگا کر دیا ، پھر چلتے چلتے آدھے سینے تک چادر ہٹا دی ۔ چوہدری اکرم نے ایک نظر مُجھ پہ ڈالی تو پھر بار بار دیکھنے لگا ۔ مَیں نے اپنے دُکھ بھرے چہرے کا تاثر بدلے بغیر دو ایک بار ایسی نظروں سے اُسے دیکھا جیسے کہ ایک عورت ہی مرد کو دیکھ سکتی ہے اور جانتی ہے کہ یہ نظریں رائیگاں نہیں جائیں گی ۔ وہ اپنا کام دِکھا گئیں ۔ چوہدری اکرم پہلے سے زیادہ [illegible] کے ساتھ ہمدردی جتانے اَور تیز تیز چلنے لگا گویا مُجھ سے زیادہ اُس کو میرے بچے کی فکر ہو ۔ چلتے چلتے میں اُسے اُس جگہ پر لے گئی جہاں دریا ایسا چڑھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا پُل کے ساتھ ٹکرا کر بہہ رہا ہے ۔ دِن چڑھ آیا تھا ۔ اَور کاروں کا کچھ ٹریفک شروع ہو چُکا تھا ، گو پیدل آدمی کوئی کوئی ہی دیکھتا تھا ۔ کچھ دُور ہی سے میں نے دوڑنا بھاگنا اَور واویلا کرنا شروع کر دیا کہ یہاں میرا بچہ تھا ، غائب ہوگیا ہے ۔ اُس مقام پر میں پُل کے جنگلے سے لٹک کر نیچے پانی میں دیکھنے لگی ، جیسے میرا خیال ہو کہ بچہ دریا میں گر کر ڈوب چُکا ہے ۔

2009/08/27 22:02

چوہدری اپنا شِفن وہیں رکھ کر دونوں ہاتھوں سے مجھے پیچھے کی طرف کھینچنے اور ساتھ ہی میری طرح آگے لٹک لٹک کر دیکھنے لگا ۔ میں نے جلدی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی ۔ پُل پہ اُس وقت ہمارے آس پاس کوئی ٹریفک نہ تھی ۔ میں نے چوہدری اکرم کا شِفن کا ڈبہ اُٹھا کر پورے زور سے جو اُس کے سر کے پچھلے حِصے پہ مارا تو وہ چکر کھا گیا ۔ اِسی چکر میں وہ کچھ سُن سا ہو کر پُل کے جنگلے پر آدھا اِدھر اور آدھا اُدھر لٹکنے لگا ، گو جنگلے پہ اُس نے اپنی گرفت نہ چھوڑی ۔ میں اُس کے پیچھے کھڑی تھی ، ٹانگوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور دوسری طرف اُلٹ دیا ۔ چوہدری اکرم کے ہاتھ جنگلے سے چھُٹ گئے اور وہ نیچے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا میں جا گِرا ۔ میں نے اُسی وقت دہائی دینی شروع کر دی ۔ پُل کی دوسری جانب جا کر دیکھا ۔ صرف ایک بار وہ پانی کی سطح سے اُبھرا ، پھر غائب ہوگیا ۔ آخر میں صرف ایک لمحے کے لئے اُس کا ایک ہاتھ میں نے پانی سے باہر نِکلا ہوا دیکھا ، پھر وہ بھی ڈوب گیا ۔ کچھ لوگ ہم سے دُور پُل پر جا رہے تھے ، میری پُکار سُن کر دوڑتے ہُوئے آئے ۔ پُل کی گارڈ سے ایک سپاہی بھاگ کر آیا ۔ میں نے کہا میرا بھائی تھا ، ڈوب گیا ہے ۔ کچھ لوگ دوڑے بھاگے ، مگر بپھرے ہوئے دریا کے مقابل کیا ہو سکتا تھا ۔ سپاہیوں نے مجھے تسلی تشفی دی ، حادثے کی خبر اِدھر اُدھر بھیجی ، میرا بیان لیا ، گواہ لکھے ، اور مجھے تانگے پہ بٹھا دیا ۔ میں اُسی رات کو ریل پہ سوار ہو کر واپس لاہور آگئی ۔"

احمد شاہ اِس حالت کو پہنچ چُکا تھا کہ گڑگڑانے پہ آگیا ۔ اُس نے رومال مُنہ سے ہٹا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے ۔

"بی بی ، یہ میرے ہاتھوں کی طرف دیکھ ،" وہ بولا ، "اِس کہانی کو اب ختم کر ۔ کیوں اپنے اُوپر گناہ چڑھاتی ہے اور ساتھ ہمیں بھی گناہگار کرتی ہے ۔ توبہ کر اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ ۔ ہاں اِتنا بتا کہ اِن بے گناہوں کا خون تو نے اپنے سر کیوں لیا ۔ کیا وجہ تھی کہ تُو اِن جرائم کی مُرتکب ہوئی ۔ ہم سب اکھٹے بیٹھ کر تیری بخشش کے واسطے دُعا کریں گے ۔"

"بس میاں جی ،" رضیہ سلطانہ بولی ۔ "یہ کہانی اب ختم ہوئی ۔ باقی رہی وجہ ۔ وجہ کا آپ کو پتا ہی ہے ۔"

"وجہ کا پتا ہے ؟" احمد شاہ حیرانی سے بولا ۔ "کِس وجہ کا پتا ہے ؟" اُس کا مُنہ

2009/08/27 22:03

آپ بند ہوگیا گویا اب کبھی نہیں کھلے گا۔
"مجھے کسی وجہ کا پتا نہیں لڑکی،" احمد شاہ غصّے سے بولا۔ "بتا کیا وجہ تھی۔ بول۔"
چند لمحے کے توقف کے بعد رضیہ نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا، "انہوں نے میرے بچے کی جان لی تھی۔"
"بچے کی؟ کس بچے کی؟" احمد شاہ متعجب ہو کر بولا۔
"پچھلے نومبر کے مہینے کو یاد کرو۔ ستائیس تاریخ تھی، اور فجر کا وقت تھا۔"
احمد شاہ یکایک بوکھلا کر ہکلانے لگا۔ "ستائیس؟ فجر کا وقت۔۔؟"
"اس بچے کو یاد کرو میاں جی جس کو آپ کی مسجد کی سیڑھیوں پر پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔"

"کون۔ کہاں؟ میں نے نہیں مارا۔۔" احمد شاہ پریشانی میں بولا۔
"درست کہتے ہو، آپ نے نہیں مارا۔ مگر انگلی کس نے اُٹھائی؟ رضیہ سلطانہ نے کہا، "میں نے اُسے آپ کی اور خدا کی جھولی میں ڈالا تھا۔ نو مہینے تک کیسی کیسی مشکلوں سے میں نے اپنے پیٹ کو چھپائے رکھا۔ مجھے دنیا کا ڈر نہیں تھا، ایک ہی خدشہ تھا کہ میرا باپ پہلے ہی فالج کا مریض ہے، اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ جس روز میرے درد شروع ہوئے میں تانگے پہ بیٹھ کے رکھوال کو آئی۔ شام کا وقت تھا۔ گاؤں کے باہر تانگے کو چھوڑا اور ایک کماد کے کھیت میں گھس گئی۔ کھیت میں داخل ہوتے ہی میرا پانی چھوٹ گیا۔ رات کے کسی وقت وہیں پہ میں نے مویشیوں کی طرح کانپ کانپ کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنے بچے کو جنم دیا۔ صبح ہو رہی تھی جب میرا بدن کانپنا بند ہوا۔ ہوش میں آئی تو دیکھا کہ میں نے بچے کو سینے سے لگایا ہوا ہے، مگر اس کا ناڑ ابھی اس کے پیٹ کے ساتھ جڑا ہے۔ میں نے قینچی سے اُس کا ناڑ کاٹا تو اُس وقت میرے دل کو ایک ایسا دھچکا لگا کہ میرا جی چاہا بچے کو لے کر گھر واپس بھاگ جاؤں۔ مگر کیا کرتی، قدم اُٹھا چکی تھی۔ کیا بتاؤں احمد شاہ، اپنے بچے کو میں نے زبان سے چاٹ چاٹ کر صاف کیا، دیکھو اس زبان سے میں نے بچے کے بدن کو پاک کیا، صاف چادر میں لپیٹا۔ دِل میں خیال آیا کہ اس کے کان میں اذان دوں۔ مگر مجبور تھی۔ ایک تو عورت ذات تھی، پھر ناپاک تھی۔ نہ اذان کا حق میرے

2009/08/27 22:03

پاس تھا، نہ میری حالت ہی ایسی تھی ۔ ہاں ایک بات سے باز نہ رہ سکی ۔ باہر نکلنے سے پہلے اپنی پھاتی اُس کے منہ میں دے کر اُسے دودھ کے چند گھونٹ پلا دیے ۔ میرے دل کو کچھ تسلی ہوئی ۔ ابھی پَو نہ پھٹی تھی کہ میں مسجد تک پہنچی، آخری بار اپنے بچے کا منہ چوما، اور اسے سیڑھیوں کی اینٹوں پر رکھ دیا ۔ میں جانتی تھی کہ آپ لاولد ہو چکے ہیں ۔ آپ کا حق تھا ۔ میرے دل میں یقین تھا کہ آپ اسے خدا کی دین سمجھ کر اٹھالیں گے اور اپنی بیوی کی گود میں جا ڈالیں گے ۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ کے سینے کے اندر ایک شیطان بیٹھا ہے ۔ ہائے میں نے غلطی پر غلطی کی، وہاں بیٹھی رہی ۔ میں تہیہ کر چکی تھی کہ ایک بار اپنے دل کے ٹکڑے کو ہاتھ سے چھوڑ دونگی تو پھر مڑ کے نہ دیکھونگی ۔ مگر کیا کرتی، چل نہ سکی، قدم زمین سے چمٹ گئے ۔ واپس چلی جاتی تو یہ دن نہ دیکھتی ۔ آخر مسجد کے سامنے مکئی کے کھیت میں جاکر بیٹھ رہی اور سیڑھیوں پہ رکھی اُس سفید گٹھڑی کو دیکھتی رہی، حتّٰی کہ فجر آن لگی اور آپ کی شکل مجھے وہاں کھڑی نظر آئی ۔ احمد شاہ، مجھے کس گناہ کی سزا ملی ۔ میں چلی جاتی تو نہ تیری منحوس شکل دیکھتی، نہ تین بے گناہوں کی جان جاتی ۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مُراد اور علی محمد اور چوہدری اکرم وہاں نماز پڑھنے آپہنچے ۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ نے واہی تباہی بکنا اور اُنگلی اُٹھا اُٹھا کر میرے بچے کی جانب اشارے کرنا شروع کر دیا ۔ جو الفاظ میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے اُن میں حرامی، اور ناجائز اور اولاد ، اور مسجد اور بے حرمتی کے لفظ بار بار آتے تھے ۔ اُس وقت میرے دل میں موت کا ہول اُٹھ رہا تھا، مگر میں سوچ رہی تھی کہ بچے کو کچھ اور دودھ پلا دیتی تو اچھا تھا، اُسے بھوک لگ رہی ہوگی ۔ اور سوچ رہی تھی کہ ابھی پیشاب کرے گا تو اس کی چادر کو کون بدلے گا، اُسے سردی نہ لگ جائے، اور سوچ رہی تھی کہ اُس کا نام کیا رکھا جائے، سنت کب ہوگی، اور خیال کر رہی تھی کہ اگر میں اُس کے کان میں اذان کی آواز پہنچا دیتی تو اللہ اسے اپنی حفاظت میں رکھتا، عورت ذات اور ناپاک تھی تو کیا تھا، اذان تو سب ناپاکیوں کو دھو دیتی ہے ۔ میں کتنی نادان تھی ۔ جب مُراد نے پتھر اُٹھاکر اُسے مارا، پھر علی محمد نے، اور چوہدری اکرم نے، تو میں نے پہلی بار اُس کی ننھی سی چیخ کی آواز سنی ۔ اُس نوزائیدہ کے سر کی ملائم ہڈی جو ایک مُٹھی میں دباکر ٹکڑے ٹکڑے کی جا سکتی تھی، بھاری پتھروں کی مار میں تھی ۔ اُس وقت میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت تھی کہ میں

2009/08/27 22:03

اُن تینوں کا کلیجہ نکال لیتی ۔ مگر ٹانگوں نے جواب دے دیا تھا ۔ میرے حلق سے چیخ بلند ہونے لگی تو آواز بیٹھ گئی ۔ بتا احمد شاہ، بتا، تو اِس بہیمانہ جرم کا مرتکب کیوں ہوا؟"

احمد شاہ کے چہرے پہ بوکھلاہٹ کی جگہ اب سراسیمگی پھیل چکی تھی ۔ اُس کی آنکھوں میں ہراس کے نشان تھے ۔ بات اُس کے مُنہ سے نہ نکلتی تھی ۔ مگر کمال ہے اُس کا کہ اپنے آپ پہ قابُو پاکر بولا، "مسجد کی حُرمت کے بارے میں خدا کے سخت احکام ہیں ۔" "حُرمت کے چوکیدار مولوی،" رضیہ سلطانہ چلّا کر بولی، "چار گھنٹے کی معصوم جان خدا کے گھر کی بے حُرمتی کرے گی؟ خُدا کا گھر اِتنا کچا ہے؟ سُن، ہم غریب لوگ ہیں، مگر میں عالموں کے گھرانے کی اولاد ہوں ۔ سُن تیرا خدا کیا کہتا ہے ۔ سورۃ بقر کو یاد کر ۔ یُصوّرکم فی الارحام ۔ میں ماؤں کے رحموں میں (بچے کی) تصویر بناتا ہوں ۔ احمد شاہ، تم اللہ کی بنائی ہوئی تصویر کو پتھروں سے پاش پاش کرتے ہو اور پاکدامنی کے دعویدار بنتے ہو؟ یہ حق تجھے کس نے دیا ہے؟ تم دوسروں کے گناہوں کا حساب چُکاتے ہو؟ پھر سورۃ بقر کو یاد کرو ۔ تِلکَ اُمّۃٌ قد خلَت لَھا ما کَسَبتُم وَ لکُم ما کَسَبتُم ولا تُسئلُونَ عَمّا کانُو یَعملُون ۔ وہ ایک اُمّت تھی جو گزر چکی، اُسے مِلے گا جو اُس نے کمایا، اور تُمہیں مِلے گا جو تُم نے کمایا، اور تم سے نہ پُوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ۔ احمد شاہ، تم کسی شے کے ٹھیکیدار نہیں ہو ۔ بے حرمتی کی بات کرتے ہو؟ رسُول کی حدیث یاد کرو ۔ فرماتے ہیں بچے کو چپت مت مارو ۔ اور فرماتے ہیں غلافِ کعبہ کی بے حُرمتی سے زیادہ مجھے انسان کی بے حُرمتی کا دُکھ ہوگا ۔ ہائے تم نے میرے ہاتھوں سے بے گناہوں کا خون کرایا ۔ جب تیسرا پتھر میرے بچے پہ گرا تو مَیں غش کھا گئی ۔ اُس وقت اِن لوگوں کے نام بھی مجھے معلوم نہ تھے ۔ مگر اُن چند لمحوں میں اُن کی تصویریں میرے دِل پہ نقش ہو گئی تھیں، میرا دِل پتھر کا بن گیا تھا ۔ جب مجھے ہوش آئے تو سورج سر پر چمک رہا تھا ۔ مسجد کی سیڑھیاں صاف تھیں، کسی شے کا نام و نشان نہ تھا، جیسے میں نے جو دیکھا وہ کوئی خواب تھا ۔ مگر میرے رحم میں جو درد پیدا ہو چکا تھا وہ خواب نہ تھا، اور تین مردوں کی تصویریں میرے اندر موجود تھیں ۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے اُٹھی اور وہاں سے نکلی ۔ جب حواس برابر ہوئے تو میں کماد کے کھیت میں

2009/08/27 22:03

چاروں ہاتھ پاؤں پہ بیٹھی کتے کی طرح وہ زمین کھود رہی تھی جہاں پہ میں نے اپنے بچے کے ناڑ کو دفن کیا تھا ۔ میرے ناخن اُدھڑ گئے تھے، مگر ناڑ میرے ہاتھ میں تھا ۔ میں نے اسے سینے سے لگایا، اپنی چھاتیاں دبا دبا کر دودھ میں اسے نہلایا، مُنہ میں رکھ کر چُوسا، اُنگلیوں سے ٹھونس ٹھونس کر اسے اپنے رحم میں داخل کرنے کی کوشش کی تاکہ دُنیا سے محفوظ ہو جائے ۔ کیا کرتی، اب یہی کچھ میرے ہاتھ میں رہ گیا تھا، باقی سب فنا ہو چکا تھا ۔ اور میرے دِل میں آگ بھر گئی تھی جو ٹھنڈی ہونے کا نام نہ لیتی تھی ۔" احمد شاہ اب غیض و غضب کی حالت میں تھا ۔ "نامُراد گناہگار" وہ چیخا، "اپنا گناہ کیوں میرے سر تھوپتی ہے ۔"

"میں گناہگار ہوں، کب انکار کرتی ہوں،" رضیہ سلطانہ بولی، "وہ لوگ بے گُناہ تھے جِن کا خون میں نے اپنی آگ بُجھانے کے لئے کیا ۔ وہ تو تمہارے کہنے پہ لگے تھے ۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا ۔ مجھے پھانسی لگا دو ۔ اصل قصور وار تو تم ہو۔ آج میں نے اقبالِ جرم کیا ہے ، تمہیں سب کچھ بتا دونگی ۔ تم پوچھو گے میں نے تمہیں کیوں چھوڑ دیا ۔ میرے دِل کی آگ اُن تین بے گناہوں کے خون سے ہی کیوں بُجھ گئی، تمہیں میں نے کیوں نہ پکڑا ۔ تو سُنو ۔ تمہیں میں نے اِس لئے چھوڑ دیا کہ تمہیں تو اپنے ہاتھوں ہی سزا مِل چکی تھی ۔ کان کھول کر سن احمد شاہ، وہ معصوم جسے تم نے اپنی زبان سے ملعون کیا، وہ تمہارا پوتا تھا ۔ کیا؟' احمد شاہ کھلے مُنہ اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اُس پہ لرزہ طاری تھا ۔ 'پوتا؟' 'ہاں ۔ فیروزشاہ کا بچہ تھا ۔ اپنے ہاتھوں تم نے اپنی نسل کُشی کی ۔ یہ ایسی سزا تھی جو میں بھی تمہیں نہیں دے سکتی تھی ۔' 'جُھوٹ ' جھوٹی مکار' احمد شاہ چلایا ۔ 'کرامت علی سے پوچھو' رضیہ سلطانہ نے بازو لمبا کر کے میری طرف اشارہ کیا ۔ 'یہ فیروز شاہ کا یار تھا ۔ گواہ ہے ۔' احمد شاہ نے وحشت بھری نظروں سے مجھے دیکھا ۔ میں بھی ہکا بکا کھڑا تھا ۔ اُس وقت میری نظروں کے سامنے وہ منظر گھوم رہا تھا جب اس واقعے کی اطلاع پاکر پولیس ہمارے گاؤں میں آئی ۔ مگر اُن کے وارد ہونے سے پیشتر ہی اس لرزہ خیز واقعے کے سارے نشان ہوشیاری سے مٹا دیئے گئے تھے ۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا گاؤں کی ساری آبادی نے اِکٹھ کر کے اس واقعے کو اپنے اپنے دامنوں میں چُھپا لیا ہو اور اپنے ذہنوں سے اس کی یاد کو محو کر دیا ہو ۔ تفتیش کے باوجود پولیس کو کوئی سُراغ، کوئی ثبوت، کوئی گواہی

2009/08/27 22:04

حاصل نہ ہو سکی تھی ۔ دباؤ ڈالنے کی خاطر دو چار اِدھر اُدھر کے لوگوں کو پکڑ کر لے گئی تھی، مگر دو ہی روز میں وہ تھانے کی مار کھا کر واپس آگئے تھے ۔ اس عرصے میں میرے خواب و خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ اِس واقعے کا رضیہ سلطانہ اور اُس کے جرائم سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا ۔ رضیہ سلطانہ نے ہم سب کو متعجب کر دیا تھا۔ اُسی حالت میں مَیں نے اثبات میں سر ہلا دیا ۔ احمد شاہ نے پہلے میری، اور پھر رضیہ سلطانہ کی جانب قدم بڑھایا، جیسے مارنے کو آرہا ہو ۔ یکایک رضیہ سلطانہ کی ہیئت میں عجیب و غریب تبدیلی آگئی ۔ ایسے معلوم ہوا جیسے اُس پہ نشے کی کیفیت طاری ہو گئی ہو ۔ اُس کی آنکھیں ذرا سی چڑھ گئیں اور اعضاء تن گئے ۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے بے شرمی سے اپنا نالہ کھولا اور شلوار گرا دی ۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ ٹانگوں کے بیچ داخل کیا اور جھٹکے سے ایک لمبی اور پتلی سی شے اپنے اندر سے برآمد کر لی ۔ بجلی کی مدھم روشنی میں پہلی نظر کے اندر معلوم نہ ہو سکا کہ وہ شے کیا تھی ۔ قدرتی طور پر ہمارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ شائد یہ کوئی اوزار تھا جو اُس نے چُھپا رکھا تھا ۔ اس خیال سے مَیں اور لیڈی وارڈر مسعودہ خانم ایک قدم آگے بڑھے ۔ مگر اُسی وقت رضیہ سلطانہ ہاتھ اُٹھا کر وہ چیز اپنی آنکھوں کے سامنے لے آئی ۔ اُس پہ بجلی کی روشنی پڑی تو ہم نے دیکھا کہ وہ ایک معمولی سا ہلکے پلاسٹک کا گُڈا تھا جیسا بچوں کے کھیلنے کا ہوتا ہے ۔ اُس کے اِرد گرد موٹا سا دھاگا کَس کر لپیٹا ہوا تھا جیسے اُسے باندھ کر رکھنے کی کوشش کی گئی ہو ۔ کھلونا اُوپر سے نیچے تک گندے خون اور رطوبت میں لتھڑا تھا ۔ اُسے دیکھ کر میرے دل میں اُبکائیاں اُٹھنے لگیں ۔ ساتھ ہی ساتھ مَیں اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ اس چھ سات انچ لمبی شے کو چھپانے کے لئے کیونکر اس عورت نے اپنے اندر جگہ پیدا کر لی تھی، اور کیونکر اتنے عرصے میں ہمیں اِس بات کا علم نہ ہو سکا تھا ۔ مسعودہ خانم نے بھی حلق سے ایسی آواز پیدا کی جیسے اُس کے دل کو دھچکا لگا ہو ۔ ہم جیل کے ملازم تھے، ہوئے تھے کہ ہم نے چوروں ڈاکوؤں اور قاتلوں کے اِس گڑھ میں زندگی کی ہر بُری بھلی چیز دیکھ لی ہے ۔ مگر ایسا نظارہ ہم نے بھی کبھی نہ دیکھا تھا ۔ ہم سب مُنہ کھولے وہاں کھڑے ہی تھے کہ رضیہ سُلطانہ کا بدن ایسے تڑپا جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو ۔ وہ اپنی تنکی ٹانگوں پہ ایک جست بھر کر احمد شاہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی ۔

2009/08/27 22:04

"او مولوی،" وہ چنگھاڑی، "دیکھ یہ تیرا پوتا ہے ۔" اُس نے وہ گُڑ احمد شاہ کی ڈاڑھی میں گھسا دیا ۔ "اِس کے ناڑ کو میں نے چھاؤں میں سُکھایا ہے، اور اس میں باندھ کر اپنی کوکھ میں لئے پھرتی ہوں ۔ یہ میری محبت کی نشانی ہے ۔ مَیں کیسے توبہ کروں ۔ ناپاک ہُوں ۔"

احمد شاہ کا سر گردن کے اُپر کانپ رہا تھا ۔ اُس کے چہرے پر وحشت تیزی سے پھیل رہی تھی ۔ اُس وقت میں نے ایک عجیب منظر دیکھا ۔ مَیں نے ایک اچھے بھلے سیانے آدمی کو لمحوں کے اندر دیوانگی کی حالت میں اُترتے دیکھا ۔ اُس کی آنکھوں میں درندگی کی چمک اُمڈ آئی تھی ۔ اُس نے دھکا دے کر رضیہ سلطانہ کو زمین پر گرا دیا اور اُلٹے پاؤں "مردود، قیدی، مردود، مردود، قیدی، قیدی قیدی،" کے نعرے لگاتا ہوا بھاگ نکلا ۔ رضیہ سلطانہ جہاں گری تھی وہیں پہ بے حیائی سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھی رہی ۔ اُس کی رانوں پہ خون کے چٹاخ دکھائی دے رہے تھے ۔ مسعودہ خانم لیڈی وارڈر نے بمشکل اُسے شلوار پہنائی ۔ پھر میں اور مسعودہ خانم کوٹھڑی کو مقفل کر کے واپس چلے آئے ۔ گیٹ تک آتے آتے ہم نے رستے میں احمد شاہ کی بکھری ہوئی چیزیں دیکھیں ۔ چارخانہ رومال، ایک کھیڑی جس کا پٹا ٹوٹ چکا تھا، مصنوعی داتوں کا پیڑھ ۔ ہم انہیں اٹھا کر دفتر میں لے آئے ۔

دفتر میں ہم کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ جیل کے باہر ایک مسجد کے سپیکر پر مؤذن نے اذان دینی شروع کر دی تھی ۔ پھانسی کا وقت قریب آرہا تھا ۔ ایک آدھ گھنٹے میں عملہ اکٹھا ہونا شروع ہو جائے گا ۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، مجسٹریٹ، ڈاکٹر، جلاد ۔ میرے دِل کو چین نہ آرہا تھا ۔ مَیں اُٹھ کر پھر رضیہ سلطانہ کی کوٹھڑی کو گیا ۔ وہ اب اپنے آپ کو سمیٹے پاؤں کے بل دیوار کے سہارے سے بیٹھی تھی ۔ اُسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اب وہ پورے طور سنبھل گئی تھی ۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا، گویا تیار بیٹھی تھی ۔ جب وہ بولی تو مجھے اپنی پُرانی والی رضیہ کی کھڑکتی ہوئی آواز سُنائی دی ۔

"سب آ گئے؟"

"نہیں،" میں نے جواب دیا ۔ "بس میں تمہیں دیکھنے آیا ہوں ۔ کیا بجا ہے؟"

2009/08/27 22:04

"پونے تین ہو رہے ہیں۔"

"چلو" وہ بولی، "یہ رات بھی گئی۔"

"رجّی" میں نے اس سے کہا، "ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ بتاؤ گی؟"

"ہاں کرامت۔"

"تم نے فیروز شاہ سے شادی کیوں نہ کی،" میں نے پوچھا۔

"کیوں کرتی،" وہ پھٹ سے بولی۔ "ساری دُنیا کا درد دِل میں لئے پھرتا تھا، جب میرے پاس آتا دو منٹ میں لُڑھک جاتا اور مُنہ پرے کر کے خراٹے لینے لگتا تھا، جیسے میں کوئی حیوان ہوں، یا کوئی پتھر کی سِل ہُوں جس پہ رگڑ کر چٹنی بنائی، کھائی، اور پرے کھڑی کر دی۔ مَیں آدم زاد ہوں، حیوان نہیں ہوں۔"

"مگر تمہیں اُس سے محبت تو تھی رجّی" مَیں نے کہا۔

"محبت کا کیا ہے،" وہ بولی، "ایک بار ہو گئی تو ہو گئی۔ اُس کے بعد تو سلوک کی بات ہوتی ہے۔ سلوک کا تم لوگوں کو کیا علم؟ ایک بات بتاؤ میں تم سے پوچھتی ہوں۔ تم لوگوں کو دُنیا بھر کی فکر لگی رہتی ہے۔ عوام عوام کرتے تمہاری باری نہیں آتی۔ ذرا بتاؤ عوام کون لوگ ہوتے ہیں؟"

میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ اُس نے میری جواب طلبی شروع کر دی تھی۔ "عام لوگ ہوتے ہیں،" میں نے جواب دیا۔

"ایسے نہیں۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔" وہ اٹھ کر کوٹھڑی کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ "سُنو۔ ایک بار میں نے فیروز شاہ سے یہ سوال پُوچھا تھا۔ اُس نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ پھر میں نے دوہرا کر پُوچھا تو بولا، غریب لوگ، ریڑھی والا، تانگے والا، رکشا چلانے والا، چپڑاسی، کلرک، غریب دُکاندار، فیکٹری کا مزدور، غریب کسان، مال ڈھونے والا۔ میں نے پوچھا اور؟ تو بولا سٹیشن کا قلی، ڈاکیہ، بس ڈرائیور۔ پھر میں نے پوچھا اور؟ بولا پھیری لگانے والے، لوہا کوٹنے والے، بجلی کا میٹر پڑھنے والے، کرسیاں بنانے والے، پولیس کے سپاہی، چاول بیننے والے، برتن قلعی کرنے والے۔ میں نے پوچھا اور تو چڑ گیا۔ بولا اور اور لگا رکھی ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں نے کہا، اور عورتیں؟ اِس پر وہ کچھ حیران ہوا۔ پھر بولا، ہاں عورتیں۔ مَیں اُس وقت ہنس دی۔ اُسے نے بے خودی میں سچّی بات کہہ دی تھی۔ تُمہارے عوام میں ہم لوگ کہاں شامل ہوتی ہیں۔" مَیں خاموش رہا۔ بولی۔ "ہم لوگ احساسِ کمتری لے کر پیدا ہوتی

2009/08/27 22:05

ہیں ۔ کوئی ہاتھ لگا جائے تو دوسروں کے منہ کی طرف دیکھتی ہیں ۔ مردوں کے منہ پر بال نکلتے ہیں تو فخر سے دُنیا کو دکھاتے ہیں ۔ ہمارے منہ پر ایک بال اگ آئے تو شرم سے سر جُھکا لیتی ہیں ۔ ہماری چھاتیاں نکلتی ہیں تو شرم سے سر جُھکا لیتی ہیں ۔ خُون جاری ہوتا ہے تو شرم سے جُھک جاتی ہیں ۔ شادی کی رات گزرتی ہے تو شرم سے باہر نہیں نکلتیں ۔ اِس سے بڑی غُربت کیا ہوتی ہے؟"

وہ رُک گئی ۔ مَیں نے دیکھا کہ وہ کان لگا کر کچھ سُننے لگی تھی ۔ مَیں بھی سُننے لگا ۔ باہر مسجد کے سپیکر پر کسی کی اچانک موت کا اعلان ہو رہا تھا ۔ جنازہ صبح دس بجے اُٹھنا تھا ۔

"تم نے کوئی جنازہ دیکھا ہے؟" وہ بولی ۔

"کئی بار دیکھا ہے ۔" میں نے جواب دیا ۔

اس پر رضیہ کے لہجے میں افسوس کی ہلکی سی جھلک پیدا ہوئی ۔ کہنے لگی ۔ "آپ لوگ صفیں باندھ کر ایک جسدِ خاکی کو خدا کے سپرد کرتے ہیں ۔ ہم جو جانکنی سے گزر کر زندگی کو پیدا کرتی ہیں ، تماشائیوں کی طرح ایک طرف کو کھڑی ہوتی ہیں اور بین کرتی ہیں ۔' پھر اس کے لہجے میں وہی جاندار کھنک واپس لوٹ آئی ۔ 'تم کہتے ہو شادی کیوں نہ کی؟ ایسے آدمیوں سے میں نے کیا لینا ہے ۔ کہتے ہو محبت ہوئی تھی ۔ محبت کہاں رہتی ہے ۔ اِس کی نشانیاں رہ جاتی ہیں ۔ بس ہم لوگ اپنی محبت کی نشانیوں سے چمٹی رہتی ہیں ۔'

میرے دل میں کوئی بات نہ بن رہی تھی ۔ میں خاموش ہو کر چلا آیا ۔

جب پھانسی کا وقت آیا تو وہ عملے کے آگے کھٹ پٹ چلتی کوٹھڑی سے نکل گئی ۔ جیل خانے کا دستور ہے جس روز علی الصبح پھانسی لگنی ہوتی ہے اُس رات کو سب 'کوٹھی' والے جاگتے ہیں اور قرآن کریم کی تلاوت کر کے بخشتے رہتے ہیں ۔ یہ ایک موقعہ تھا جب میں نے دیکھا کہ وہ اِس دستور سے ہٹ گئے تھے ۔ کسی نے تلاوت نہ کی، گو رات بھر رضیہ سلطانہ اور احمد شاہ کی باتوں کی آواز ان کے کان میں پڑتی رہی تھی ۔ جب رضیہ اُن کے آگے سے گزر رہی تھی سب جاگ رہے تھے، مگر اپنی کوٹھڑیوں کے دروازوں پر خاموش کھڑے تھے ۔ اُن کی نظریں بولتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، جیسے کہہ رہی ہوں، جانے دو ۔ ۔ ۔ شروع سے ہی اُن کے اندر رضیہ سلطانہ کے لئے وہ جذبہ موجود نہ تھا جو کسی

2009/08/27 22:05

دوسرے کو ٹھی والے کی خاطر ہوتا ہے ۔ ایک تو عورت ہو کر اس نے تین مردوں کو قتل کیا تھا' اور پھر استغفار سے بھی انکاری تھی ۔

ٹھیک چار بجے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، مجسٹریٹ اور ڈاکٹر کی موجودگی میں رضیہ سلطانہ کو پھانسی لگ گئی ۔ میں وہاں موجود نہیں تھا، پہلے ہی بیماری کا بہانہ کر کے گھر واپس چلا آیا تھا ۔ وہ واقعہ جو رات کو پیش آیا اُس کی سوائے میرے اور مسعودہ خانم لیڈی وارڈر کے کسی کو پوری خبر نہ ملی ۔ اگلے روز مقامی اخبار میں چھوٹی سی خبر چھپی ۔

"شالامار کی بدنام قاتلہ رضیہ سلطانہ عُرف رجو میر کو کل صبح چار بجے پھانسی پر چڑھا دیا گیا ۔ آخری دم تک مجرمہ نے عدم تعاون کا رویہ رکھا اور کوئی بات منہ سے بیان نہ کی ۔ کسی کو علم نہ ہو سکا کہ اس نے کس وجہ کی بناپر ایسے انسان سوز جرائم کا ارتکاب کیا ۔ یہ راز مرحومہ رضیہ سلطانہ اپنے سینے میں ہی لے کر دُنیائے فانی سے کُوچ کر گئی ۔"

پیر کرامت علی شاہ نے کہانی ختم کر کے سر اُٹھایا تو اُن کے چہرے پر ایک فخریہ انداز تھا، گویا کامیابی سے داستان مکمل کر کے انہوں نے کارنامہ انجام دیا ہو ۔ سلامت علی محویت کے عالم میں آگے جُھک کر بیٹھا سن رہا تھا ۔

"پھر؟" اُس نے پوچھا ۔ یہ لفظ اُس کے مُنہ سے نکلنا ہی تھا کہ پیر کرامت علی کا رنگ بدل گیا، جیسے کسی ان دیکھے ہاتھ نے اُنہیں بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور زمانۂ حال میں لا پٹکا ہو ۔ اُن کے چہرے پہ ہزیمت کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے ۔

"بس،" وہ بولے، "بس ۔" اُنہیں کوئی بات نہ سُوجھ رہی تھی وہ ایک بار ہکلاتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر لفظ ادا نہ ہوئے ۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سراسیمگی جس کا ذکر وہ کچھ دیر پہلے احمد شاہ کی مَد میں کر رہے تھے، اُن کے اپنے اندر سرائیت کرتی جا رہی تھی ۔

"بس؟" سلامت علی نے دوہرا کر پوچھا ۔

پیر کرامت علی کے لئے راہ فرار نہ رہی تو کہنے لگے ۔ "بس یہی کہانی ہے ۔ اس کے آگے جو کچھ ہوا، وہ میری سمجھ سے باہر ہے ۔" اُن کی آواز پھر ٹوٹ کر چھوٹی تھی

2009/08/27 22:05

"کیا ہوا شاہ جی؟"

"اس بات کو رہنے دو" پیر کرامت علی بولے، "کیوں اصرار کرتے ہو۔"

"مجھے بتاؤ شاہ جی۔"

"میں بتا ہی چکا ہوں۔ اور کیا بتاؤں۔ میں اب کسی لائق نہیں رہا۔"

"شاہ جی، اُس عورت نے آپ کے ساتھ کیا کیا، میری سمجھ سے یہ بالاتر ہے۔"

"اُس نے کیا کرنا تھا۔ میرے اپنے نفس کی بات ہے۔" پیر کرامت علی نے کہا۔ "کیا بات ہے۔" سلامت علی نے اصرار کیا۔ پیر کرامت علی نے لاچاری سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ آخر انہیں بولنا ہی پڑا۔ "میں ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس واقعے کو کئی روز گزر گئے۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اُس بد بخت کا منظر میرے دل پر بیٹھتا جا رہا ہے۔ میں اپنے ازدواجی حقوق حاصل کرنے کو جاتا تو وہ لہو میں لتھڑا ہوا گڈا جو اُس نے خدا جانے اپنی کس کوکھ سے کھینچ کر نکالا تھا، میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ ساتھ ہی میرے اعضاء میں ٹیس اُٹھنی شروع ہو جاتی، جیسے وہاں زخم پیدا ہو گئے ہوں۔ میرے پٹھے سُکڑ جاتے۔ میں نے خیال کیا وقت کی بات ہے، وقت گزر جائے گا۔ مگر یہ منظر تو میری آنکھوں کے پردوں پر پتھر کی لکیر کی طرح جم گیا تھا۔ لاکھ حیلے کئے، یہ مدھم نہ پڑا، نہ اس کا اثر کم ہوا۔ ایک نوزائیدہ کے ناڑ میں بندھا ہوا وہ کھلونا جس سے خون اور رطوبتوں کے قطرے ٹپک رہے تھے، میری مردانگی کا سرقہ کر کے لے گیا۔ مجھے ہر عورت کی رانوں پہ گندے خون کے چٹاخ نظر آتے ہیں۔ کئی مہینے گزر گئے تو آخر مجھے پتا چلا کہ میں اب ہمیشہ کے لئے عورت کے ناقابل ہو چکا ہوں۔

اب کے سلامت علی نے آگے پوچھنے پر اصرار کیا نہ جواب طلب نظروں ہی سے اپنے باپ کو دیکھا، بلکہ سر جھکائے بیٹھا فرش پہ بے خیالی سے کھینچتا رہا۔ اب پیر کرامت علی شاہ کی نظریں اپنے بیٹے پہ لگی تھیں۔ ان میں ایک التجا تھی۔ پیر کرامت علی شاہ نے ایک عمر ہوئی کسی سے التجا کی تھی۔ ہزاروں ملتجی نظروں کو وہ خود روزانہ ہاتھ اُٹھا کر فیض پہنچاتے خدا کے فضل و کرم سے ہمکنار کرتے تھے۔ مگر صاحبزادہ سلامت علی شاہ کی بات اور تھی۔ وہ اُن کی گدی کا وارث تھا۔ وہ اُس سے اپنی بخشش کے طلبگار تھے۔

"اُس ایک عورت نے مجھے زندگی بھر کی قید میں ڈال رکھا ہے۔ وہ

2009/08/27 22:05

بولے ۔ "اب میں صرف ان کے بدن پر ہاتھ پھیرتا ہوں ۔ اور کچھ نہیں کرتا ۔ انھیں پاک صاف چھوڑ دیتا ہوں ۔ نسرین کو بے اُمید نہیں لوٹا سکتا تھا ۔ کسی غلط خیال کو دل پر مت لگاؤ ۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

سلامت علی ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ، ان کی طرف دیکھے بغیر اٹھا اور کمرے سے نکل آیا ۔ پیر کرامت علی کی لاچار نظریں دروازے تک اُس کا تعاقب کرتی رہیں ۔ جب سلامت علی حُجرے سے نکل رہا تھا تو اُس نے سائیں نانگے کو دروازے کے پیچھے کھڑے پایا ، جیسے دیر سے چُھپ کر کھڑا ہو ۔ ایک لمحے کی حیرت سے اس نے سائیں نانگے کو دیکھا ، اور باہر نکل آیا ۔ احاطے میں پہنچ کر اس نے ایک لمبی سانس کھینچی ۔ آسمان پہ پچھلی رات کے ٹوٹے پھوٹے چاند کو دیکھ کر اس کے دل سے پچھلی راتوں کے کئی گنڈ خیال گزرے ۔ تازی ، جواب تین بچوں کی ماں بن چکی تھی ۔ مچھر دانی کی موری جہاں سے مچھر اندر گھس کر کان میں شور مچاتے تھے ۔ ایک ویران کنوئیں کا منظر ۔ ۔ سلامت علی کے دل میں عجیب سی مُردنی کا اثر تھا ، جیسے خیال آ رہا ہو کہ جادوؤں کے ٹوٹنے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ۔

حُجرے کے اندر پیر کرامت علی شاہ کا دل بیٹھتا ہی چلا جا رہا تھا ، جیسے بیٹے کے دل کی مُردنی پھیل کر ان کے بدن پہ طاری ہوتی جا رہی ہو ۔ یہ زندگی میں پہلی بار تھی کہ ان کا بیٹا ان کی بات کو چھوڑ کر اٹھ گیا تھا ۔ کچھ دیر کے بعد وہ جہاں بیٹھے تھے وہیں پہ ڈھے گئے ، پہلو کے بل سکڑ کر لیٹ گئے اور بازو پہ سر رکھ کر خواب میں چلے گئے ۔ خواب کی حالت میں انہوں نے کئی الٹے سیدھے منظر دیکھے ، جن میں عورتوں کے سینکڑوں بے لباس جسم بھی تھے جو خون کے چھوٹے بڑے دھبوں سے ڈھکے پڑے تھے ۔

صبح سویرے سلامت علی کو ایک نوکر نے آ کر جگایا تو کاؤں کاؤں کہرام مچا تھا ۔ پیر کرامت علی شاہ بابا چدر والے اپنے حُجرے میں مردہ پائے گئے تھے ۔ ان کے جسم پر کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرتی موت مرے ہیں ۔ یہی رپورٹ قانونی کاغذات میں بھی تحریر میں آئی ۔

بابا چدر والے کے گزرنے کی خبر آس پاس کے کاؤں میں جنگل کی طرح پھیل رہی تھی ۔ لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر کچے کھوہ کی گدی کو چلے آ رہے

2009/08/27 22:06

تھے ۔ عورتیں بین کر رہی تھیں ۔ ایک قیامت کا سماں تھا ۔ دیکھنے والوں کا کہنا تھا کہ موت کی حالت میں بابا چدّر والے کے چہرے پہ جو نور تھا پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ رحمت کا فرشتہ نازل ہوا اور پیر صاحب کی رُوح کو اپنے ہاتھوں میں لے کر فردوس بریں کو پرواز کر گیا ۔

اُس لحظے مغرب کی جانب سے ایک اور جنازہ اٹھا چلا آ رہا تھا ۔ یہ سائیں نانگے کا جنازہ تھا ۔ اُس کی لاش کچّے کھوہ سے چار کوس کے فاصلے پر کچی سڑک کے کنارے پڑی ہوئی ملی تھی ۔ یہ سڑک رکھوال کو جاتی تھی ۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ سائیں نانگا رکھوال کا رُخ کر رہا تھا کہ کسی وجہ سے راستے میں ہی گر کر مر گیا ۔ اُس کے بدن پہ بھی کوئی ضرب کا نشان نہ تھا ، اور چہرے پہ ایک ہونق سی مسکراہٹ کا اثر تھا ۔ کچّے کھوہ کو آتے ہوئے کچھ لوگوں نے اُس کی لاش کو اُٹھا کر چارپائی پہ ڈالا اور گدی پہ لے آئے ۔ کچا کھوہ پہنچ کر سائیں نانگے کی لاش کو بھی دفنانے کے لئے احاطے میں ایک طرف کو رکھ دیا گیا ۔

۔ ۔ ۔ چارپائی کے اوپر ایک کھیس پھیلا کر لاش کو ڈھک دیا گیا ۔ کچھ دیر تک وہ لوگ جو اسے اٹھا کر لائے تھے ارد گرد بیٹھے رہے ، پھر اُٹھ کر کھانے پینے کی غرض سے دربار کے لنگر کو چلے گئے ۔ واپسی پر وہ بابا چدّر والے کے جسدِ خاکی کی زیارت کرنے والے ہجوم میں شامل ہو گئے ۔ جنازے کا انتظام کرنے والے عملے میں سے کسی نے چارپائی خالی دیکھ کر کچھ کھیسوں ، چادروں اور تکیوں کے بنڈل لاکر چارپائی کے اُوپر ڈھیر کر دیے ۔ کچھ دیر کے بعد ہجوم میں مزید اضافہ ہوا تو لنگر والوں کو اپنے کام کے لئے جگہ کی تلاش شروع ہوئی ۔ اُن کے آدمیوں نے کھیس کے ڈھیروں کو ترتیب دے کر جگہ ہموار کی اور اُس کے اُوپر کچی سبزی کے تھال لا رکھے ۔ ارد گرد انہوں نے پینے کے پانی کے گھڑے رکھ کر حصار باندھ دیا تاکہ اُس کے اندر خوراک کے تھال محفوظ رہیں ۔ پھر چارپائی کے گرد چوکیوں پہ بیٹھ کر پیاز اور لہسن چھیلنے اور سبزیاں کاٹنے لگے

کہا جاتا ہے کہ بابا چدّر والے کے جنازے کی افراتفری اور آہ و بکا کے اندر سائیں نانگے کی لاش بھول بھلا گئی اور کئی روز تک ایک کھیس کے نیچے چارپائی پہ پڑی رہی ۔ چارپائی ڈھیلی ڈھالی تھی ۔ سائیں نانگے کی منحنی سی کھیس تلے معلوم نہ پڑتی تھی ۔ کسی نے دیکھا بھی تو خیال کیا کوئی بچہ سویا ہے ۔ آخر جب چارپائی کو اٹھانے کی ضرورت پڑی تو کھیس کو الٹایا گیا ۔ دیکھنے والوں کی

2009/08/27 22:06

بات رہے کہ دو آدمی وہاں کھڑے کھڑے بیہوش ہو کر گر پڑے ۔ باقی کے بھاگ کر کچھ دور جا کھڑے ہوئے ۔ دہشت کے مارے اُن کی زبانیں بند ہوگئیں ۔ سائیں نانگے کی نعش پہ کیڑے رینگ رہے تھے، گو اُس کا چہرہ سلامت تھا اور اُس پہ وہی ہونق سی مُسکراہٹ بکھری تھی ۔

ایک خادم نے جاکر صاحبزادہ سلامت علی کو خبر کی ۔ وہ آئے اور ایک منٹ تک نعش کو دیکھتے رہے ۔ پھر اُنہوں نے دفنانے کا حکم جاری کیا اور واپس چلے گئے ۔ احاطے کے ایک کونے میں، جہاں نظر نہ جاتی تھی ، جلدی سے قبر کھودی گئی ۔ نئی چادر میں سائیں نانگے کو کفنا کر تیرہ چودہ آدمیوں نے ایک درویش لڑکے کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی ۔ پھر خاموشی سے سائیں نانگے کو دفن کر دیا گیا ۔

حُجرے کی جگہ پہ مزار کی تعمیر کا کام شروع ہو چُکا تھا ۔

2009/08/27 22:06

اختتامیہ

رسمِ چہلم کا منظر :۔

کچے کھوہ میں سینکڑوں کا مجمع تھا ۔ پیر کرامت علی شاہ کے چہلم تھے ۔ ساتھ ہی صاحبزادہ سلامت علی شاہ کے عروس منعقد ہو رہے تھے ۔ ختمِ چہلم کے ایک گھنٹہ بعد سلامت علی شاہ کی گدی نشینی کی رسم ادا ہونا تھی ۔ جوق در جوق مُرید اور معتقدین وارد ہو رہے تھے ۔ لوگوں کا جلسہ دربار کے احاطے سے نکل کر گاؤں بھر میں پھیل چُکا تھا ۔ آدھے احاطے کے اندر کھانا پک رہا تھا، جہاں سو کے قریب دیگیں چڑھی تھیں ۔ باقی کے آدھے حصّے میں، جو کوئی لیک لیکڑ کے رقبے پر محیط تھا، قناتیں لگی تھیں، جن کے اُوپر وسیع و عریض تنبو سایہ کئے ہوئے تھے ۔ ان کے اندر ایک سرے پر تین چار چھوٹی قناتیں استوار تھیں ۔ جن سے خواص کی نشست کے لئے ایک 'کمرہ' تیار کیا گیا تھا جو کمرے کے طور پر ہی سجایا گیا تھا ۔ زمین پر سرخ قالین بچھے تھے اور ارد گرد لمبے لمبے صوفے رکھے ہوئے تھے ۔ صوفوں کے آگے میزیں بچھی تھیں ۔ میزوں پر گلدان اور گلدانوں میں پھُولوں کے گلدستے سجے تھے ۔ ایک طرف پیتل کا چمکتا ہوا پیچواں حُقہ کھڑا تھا ۔ بیچ میں ایک لمبے چوڑے قالین پر دو گاؤ تکئے پڑے تھے اور باقی کی جگہ خالی تھی ۔ یہ جگہ قوالوں کے لئے مخصوص تھی ۔ دستار بندی کی رسم کے فوراً بعد قوالی کا وقت مقرر تھا ۔

دربار پر قوالیاں ہر تیسرے چوتھے منعقد ہوتی رہتی تھیں ۔ مگر آج کے بعد صاحبزادہ صاحب کے حکم پر چہلم تک کے لئے بند کی جا چکی تھیں چنانچہ آج کا دن قوالیوں کے لئے خاص الخاص موقع تھا ۔ اس مقصد کے لئے قوالوں کی دو ٹولیاں پچھلے تین روز سے گاؤں میں مقیم تھیں ۔ اُن کی رہائش کا بندوبست گاؤں میں ایک علیحدہ مکان کے اندر کیا گیا تھا، اور خورد و نوش کے لنگر کی

2009/08/27 22:07

بجائے ان کا کھانا گھر سے پک کر جاتا تھا ۔ خوراک میں مُرغن کھانوں کے علاوہ قوالوں کی خاص فرمائش پر تازہ مکھن کے پیڑے بھیجے جاتے تھے ۔ قوالیوں کا علم رکھنے والے جاتے تھے ۔ کہ چھ چھ گھنٹے تک سینے کا زور لگانے والوں کے لئے تازہ مکھن کے پیڑے خوراک کا لازمی جُزو ہوا کرتے تھے ۔ سارے جلسے کو خبر تھی کہ قوالیاں شام سے شروع ہو کر رات بھر جاری رہیں گی ۔ ان کے اشتیاق میں ختمِ چہلم کے ہجوم نے ایک میلے کی شکل اختیار کر رکھی تھی ۔ پیر صاحب کی حیات کے دوران قوالیاں عموماً حُجرے کے سامنے میدان میں ہوا کرتی تھیں ۔ پیر صاحب ایک روغنی پلنگ پہ تشریف فرما ہوتے تھے ۔ باقی سب چھوٹے بڑے سمیت قوال نیچے دریوں اور چادروں پہ بیٹھتے تھے ۔ کبھی پیر صاحب پلنگ پہ نیم دراز ہو جاتے اور کسی مُرید پہ خاص نظرِ عنایت پڑتی تو اسے اشارہ کرتے ۔ وہ آدمی اُٹھ کر پلنگ کی چوکاٹھ پہ بیٹھ جاتا اور پیر صاحب کے پاؤں دبانے لگتا ۔ عام طور پہ قوالوں کی بیٹھک مغرب کی نماز کے فوراً بعد شروع ہوتی ۔ پہلے ایک دو گھنٹے سماں باندھنے میں صرف ہو جاتے ، پھر نمازِ عشاء کے لئے مجلس برخاست ہوتی ۔ نماز کے بعد قوال کچھ ہلکا کھانا تناول کرتے اور اصل محفل کا آغاز ہوتا ۔ اگر قوالوں کی دو ٹولیاں موجود ہوتیں، تو پہلے کچھ کم درجہ کی ٹولی حاضر ہوتی اور گھنٹہ دو گھنٹہ قوالی کرتی ۔ پھر فارغ ہو کر ایک طرف کو بیٹھ جاتی اس کے بعد بڑے قوال آتے اور اپنی محفل شروع کرتے ۔ اُن کی اوّلین سُر کے اٹھنے کے ساتھ ہی سامعین کو اُن کے درجے کا احساس ہو جاتا اور مجمعے پہ ایک پر سکوت خاموشی چھا جاتی ۔ چونکہ قوالیوں کا انداز خُدا اور رسول اور ان کا قرب رکھنے والے محبوب بندوں کی مدح سرائی کا ہوتا ، اس لئے رات کا یہ وقت اور سناٹا روحانیت کا پُر شکوہ ماحول قائم کرنے کے لئے عین موزوں ہوتا تھا ۔ پچھلی رات کا وقت ہوتا اور قوالوں کے گلے کی سُرتان اور دل میں ہلچل مچا دینے والی نعتیں اور غزلیں اپنے عروج پہ ہوتیں تو سامعین میں کسی کسی پہ ، یا عورتوں کے ٹولے میں مدح رسول سنتی ہوئی کسی نیکی عمر کی فقیرنی یا جن کے سائے والی عورت پہ مست عالم طاری ہو جاتا ۔ اس عالم میں وہ مست عورت یا مرد اپنے سر یا اُوپر دھڑ تیزی سے گول گول گھمانے اور 'حق ۔ ہُو' کے نعرے لگانے شروع کر دیتا، جس سے آس پاس ایک ہلچل مچ جاتی ۔ ان مست شخصوں میں سے کبھی کوئی اُٹھ کھڑا ہوتا اور اُچھلنے کُودنے اور اپنی الگ تانیں اُٹھانا شروع کر دیتا ۔ پھر ساتھ بیٹھے

2009/08/27 22:07

لوگ اُسے نرم ہاتھوں پکڑ کر آرام سے زمین پر لٹا دیتے اور اُس کے اوپر بیٹھ جاتے ۔ اس طرح وہ جلدی سے اس کی سانس روک کر قابو میں کر لیتے اور اس کی حرکات کو قوالی میں خلل انداز نہ ہونے دیتے ، بلکہ اس کے برعکس ان مستوں کی موجودگی محفل میں خدا کی بندگی اور تقدس کا سماں پیدا کرنے میں اضافت کے طور پر کام کرتی اور مجمعے پر روحانیت کا اثر مزید بڑھ جاتا ۔ قوالی عموماً دو تین بجے تک چلتی، اور کبھی فجر کی نماز تک جاری رہتی ۔ جب قوالی ختم ہوتی تو جذبات کے اس طویل اتار چڑھاؤ کی بدولت سامعین کے دل اور دماغ خالی ہو چکے ہوتے تھے ۔ اُن کے دِل بُغض اور کدورت سے پاک اور بدن آلائشوں سے دُھل چکے ہوتے اور وہ اس دُنیا کی قید اور اس کی مشقت سے بے خبر ہو کر آنے والی دُنیا کے پُر لطف تصور میں رچے بسے ہوئے گھروں کو لوٹتے ، جبکہ قوالوں کے پیٹ اُس وقت بُھوک سے کُڑ کُڑا رہے ہوتے ۔ وہ جلدی سے قیام گاہ پہ پہنچ کر گھی میں تر پلاؤ اور بُھنے ہوئے مرغوں پہ پل پڑتے ، سینے کی خرچ شدہ قوت کو بحال کرنے کی خاطر مکھن کے پیڑے نوش کرتے ، اور اس کے بعد آرام کی نیند سو جاتے ۔ پیر صاحب کبھی قوالی کے دوران ہی اُٹھ کر تشریف لے جاتے ، اور اگر قوال ان کی پسند کے ہوتے تو تا دیر بیٹھے رہتے ۔ قوالی سے وہ حسبِ معمول حجرے میں جاتے اور غرض مندوں کی جانب اپنی توجہ مبذول کر دیتے ، دم پھونک کرتے، تعویز دیتے، اور ان سے فارغ ہو کر استخارے کے عوامل کی تکمیل کرتے تھے ۔ دن کا بیشتر حصہ وہ آرام و استراحت کی حالت میں بسر کیا کرتے تھے ۔

آج کے دن کے لئے صاحبزادہ صاحب کے حکم کے مطابق قوالوں کا مقام مقرر شدہ جگہ سے ہٹا کر اُس قنات در قنات کمرے میں منتقل کیا جا چکا تھا جس خاص موقع پر معزز مدعوئین میں پیر جسامت علی شاہ کے علاوہ چوہدری محمد خاں، جو حلقے کے نئے ایم ۔ این ۔ اے تھے ۔ اور حال ہی میں زرعی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لینے کے مقدمہ میں ضمانت پر رہا ہو کر آئے تھے، کی شرکت متوقع تھی ۔ موقع کی اہمیت کے پیش نظر مُلک کے چوٹی کے قوال مصور علی اور علی برادران اور اُن کے سازندے آج ہی دو کاروں میں گاؤں پہنچے تھے اور اس وقت کھانے سے فارغ ہو کر سوئے پڑے تھے ۔ صاحبزادہ نے قوالوں کے لئے خاص حکم جاری کر رکھا تھا کہ اُن کا تخاطب پیر صاحب جسامت علی شاہ اور چوہدری امتیاز

2009/08/27 22:08

محمد خاں ایم ۔ ایس ۔ اے ۔ کی جانب مبذول رہے ۔ مہمانوں کی عزت افزائی کی خاطر صاحبزادہ صاحب کے حکم کی لفظ بہ لفظ تعمیل کرنا قوالوں کے دستور میں شامل تھا ۔

چھوٹی قناتوں کے کمرے سے باہر بڑی قناتوں اور وسیع تنبوؤں کے حلقے میں عام لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ پر دریاں بچھی تھیں ۔ ان دریوں کے عین بیچ میں پچیس کے قریب درویش لڑکے رحلوں پر قرآن مجید کی جلدیں کھولے بلِ بلِ کر تلاوت کر رہے تھے ۔ باقی جگہ فی الحال خالی تھی ، جہاں کچھ بچے کھیل کود میں مصروف تھے ۔ ہر طرف ایک گہما گہمی کا عالم تھا ۔ ختمِ چہلم کی انتظار ہو رہی تھی ۔

صاحبزادہ سلامت علی شاہ کا ظہور :۔

حُجرے کے اندر جس کے گرداگرد مزار کی عالیشان عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں کھدائی کا کام شروع ہو چکا تھا ، صاحبزادہ سلامت علی شاہ بحاطر رسم دستار بندی وگدی نشینی تیار ہو رہے تھے ۔ اُن کے ساتھ چوہان برادران کے منجھلے چوہدری ہاشم علی چوہان کے علاوہ پیر صاحب کے پرانے خادمین اور معتبر مُرید موجود تھے ۔ پیر صاحب کرامت علی شاہ کی وفات کے بعد ان معتمدین میں ایک نام کا اضافہ ہوا تھا ۔ یہ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ارشاد احمد خاں تھے جو فوج سے پنشن یافتہ ہو کر خالص دینی زندگی کو اپنا چکے تھے ۔ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) صاحب عرصہ چند سال سے پیر صاحب مرحوم کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے ۔ پیر صاحب کی وفات کے فوراً بعد بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ارشاد احمد خان نے موقع دیکھتے ہی صاحبزادہ سلامت علی شاہ سے یکے بعد دیگرے کئی ملاقاتیں کی تھیں ۔ اُنھی نے صاحبزادہ صاحب کو بتایا کہ پیر صاحب مرحوم و مغفور نے ایک سے زائد بار اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) صاحب اُن کے فرزند صاحبزادہ صاحب کو مزید تربیت کی غرض سے اپنی مشاورت سے مُستفید کریں اور آئندہ زندگی ، خاص طور پر ریاست کے سلسلے میں اُن کے صلاح کار بنیں ۔ لیکن اُس وقت چونکہ وہ فوج کی ملازمت میں تھے ۔ اس لئے کار آمد ثابت نہ ہو سکے تھے ۔ اب جبکہ دنیاوی کاموں سے فراغت پا چکے تھے، اپنی خدمات پیش کرنے کے واسطے ہوئے تھے ، تاکہ جو کام اُن کے لائق سمجھا جائے سپرد کیا جائے ۔ صاحبزادہ سلامت علی

2009/08/27 22:08

گو عمر کے اُنیس سالہ تھے مگر دماغ اُنہوں نے اس سے دُگنی تگنی عمر کا پایا تھا، آسانی سے کسی کی باتوں میں نہ آنے والے تھے ۔ مزید برآں لاہور کے اندر کالج کی چارسالہ زندگی نے اُنہیں بے مثل تجربے کا علم عطا کیا تھا ۔ نتیجے کے طور پر وہ اپنی کم عمری کے باوجود ایک ایسے انسان کا فہم رکھتے تھے جو ایک نظر میں صورت حال کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا ۔ اور اس کے امکانات کا جائزہ لیکر اس کے محور کو گرفت میں کر لینے کی قوت رکھتا تھا ۔ خاص طور پہ والد کی وفات کے بعد ان چار چھ ہفتوں میں انہوں نے جتنی تیزی سے اعتمادِ نفس حاصل کیا تھا وہ حیران کن تھا ۔ وہ اپنے باپ کی نسبت قطعی مختلف قسم کے آدمی تھے ۔ پیر صاحب مرحوم کی زندگی ہزاروں پیچ دار راستوں سے گزر کر تمام ہوئی تھی ۔ اپنی حیات کے دوران انہوں نے عالی ترین رُتبہ پایا تھا ۔ اس کے باوجود ان کے اندر ایک ملگجا ماضی رکھنے والے آدمی کا عدمِ اعتماد تھا جو جائے نہ جاتا تھا، اور جو آخر اُن کو زندگی کے ایسے مقام پہ لے آیا تھا جہاں اس کے نازک تار جھنجھنا کر ٹوٹ گئے تھے ۔ ان کے مقابلے میں صاحبزادہ سلامت علی کے نفس میں کسی بے یقینی کی کیفیت ڈھونڈے نہ ملتی تھی ۔ اُن کی زندگی ایک ایسے ڈھب پہ استوار ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا گویا خود اعتمادی اور خودراستگی اُنہیں ورثے میں ملی ہو ۔ اسی وجہ سے باپ کی موت نے گو اُنہیں صدمہ پہنچایا تھا مگر یہ واقعہ ان کے لئے ایک سانحہ ثابت نہ ہوا تھا ۔ صرف ایک آدھ روز کے لئے اُن کے دل پہ سخت تعجب کی کیفیت طاری رہی تھی کہ آخر کیوں اُن کے والد بغیر کسی ظاہری علامت کے اچانک فوت ہوگئے تھے ۔ صاحبزادہ کی سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی ۔ مگر اس بات پہ اُنہوں نے مزید وقت ضائع نہ کیا تھا ۔ کفن دفن کے بعد چند روز کے اندر ہی انہوں نے دربار اور اس کے وسائل کا تمام نظم و نسق اپنے قابو میں کر لیا تھا ۔ جب بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ارشاد احمد خاں نے اُن سے ملاقات کی تو صاحبزادہ سلامت علی شاہ اُن کے اندازِ گفتگو اور طرزِ خیال سے متاثر ہوئے ۔ فوج کے محکمہ سپلائی میں بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) صاحب کے طویل تجربے کو دیکھتے ہوئے صاحبزادہ صاحب ان کے امکانات کو ایک نظر میں بھانپ گئے اور دوبارہ ملاقات کی خواہش ظاہر کی ۔ اس طرح چند ملاقاتوں کے بعد صاحبزادہ نے بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) کو اپنا مشیرِ خاص مقرر کر لیا ۔ اب وہ بیشتر معاملات میں بریگیڈیئر (ریٹائیرڈ) صاحب سے صلاح مشورہ لیتے رہتے تھے ۔

2009/08/27 22:08

حُجرے میں صاحبزادہ سلامت علی باہر آنے کے لئے تقریباً تیار ہو چکے تھے ۔ جو لباس انہوں نے زیبِ تن کیا تھا اُس کی تیاری میں انہوں نے دو روز تک عرق ریزی کی تھی ۔ سب سے پہلے ان کے خیال کے مطابق یہ ضروری تھا کہ سلسلہ کرامتیہ کا اپنا نشان وضع کیا جائے جس سے اس کی خاص پہچان قائم ہو ۔ کسی اور پر بھروسہ کرنے کی بجائے صاحبزادہ نے بذاتِ خود رات بھر جاگ کر اس کا ڈیزائن تیار کیا تھا، جو یوں تو سبز پس منظر میں چاند اور چند ستاروں پہ مُشتمل تھا، مگر اس کی ترتیب ایسی تھی کہ نظر اس پہ جم جاتی تھی ۔ پھر وہ دستار کی جانب متوجہ ہوئے ۔ لڑکپن کے زمانے میں ایک بار انہوں نے کسی کتاب میں حیدر آباد دکن کے نظاموں کی تصویریں دیکھی تھیں اور اُس وقت سے اُن کی دستاریں صاحبزادہ کے دِل پہ لگی ہوئی تھیں ۔ اُنہوں نے معمولی ردو بدل کے ساتھ اس کی تصویر بنائی اور اپنے درزی کو بلا کر ہدایات دیں ۔ دو روز کے بعد جب درزی دستار کو لے کر، جس کے ماتھے پر سلسلۂ کرامتیہ کا نشان کاڑھا ہوا تھا ، حاضر ہوا اور صاحبزادہ نے اسے سر پہ جما کر شیشے میں اپنا عکس دیکھا تو انہیں محسوس ہوا جیسے دُنیا بھر کی دولت انہیں مل گئی ہو ۔ اس وقت حجرے کے اندر اپنے مریدوں میں گھرے ہوئے وہ اُسی دستار کو سر پہ رکھے ، سفید سلک کی شیروانی اور سفید شلوار پہنے کھڑے تھے تو ان کے چہرے پہ ایک ایسا جمال اور جلال جھلک آیا تھا کہ بارہ آدمیوں کے اُس جمگھٹے پر اچانک خاموشی چھا گئی ۔ ایک ایک نے اپنی زبان روک لی اور دو منٹ تک ایسے مبہوت کھڑے رہے کہ صرف سانس کی آواز سنائی دیتی رہی ۔ اس سناٹے میں صاحبزادہ سلامت علی شاہ نے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا ۔ اس ہاتھ کی درمیانی اُنگلی میں پیر صاحب مرحوم کی الماس جڑی انگوٹھی چمک رہی تھی ۔ ان کے بدن پر صرف یہی شے تھی جو صاحبزادہ سلامت علی نے اپنے باپ سے مستعار لی تھی ، باقی سب ان کا اپنا تھا ۔ جب اُن بارہ آدمیوں نے اپنے سامنے وہ انگوٹھی دیکھی تو سب کے شانے اس طرح ایک ساتھ خم ہو گئے جیسے اُن پہ کوئی ان دیکھا دبدبہ طاری کیا ہو ۔ ان کے بیچ سے 'بُش' کی مختصر سی آواز پیدا ہوئی جیسے کہ ان کا مجموعی سانس ایک لحظے کو رک گیا ہو ۔ سب سے پہلے بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ارشاد احمد خان نے اپنے گھٹنوں پہ گر کر اُس ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا، اُسے چوم کر آنکھوں سے لگایا ، اور اُٹھ کر پچھلے قدموں چلتا ہوا پیچھے جا کھڑا ہوا ۔ اُس کے بعد دوسری

2009/08/27 22:09

ہاشم علی چوہان اور پھر باقی کے دس آدمیوں نے مکمل خاموشی کے اندر وہی عمل دُہرایا ۔ جب آخری آدمی جاکر اُن میں شامل ہوگیا تو صاحبزادہ نے ہاتھ ہوا میں اُٹھا کر ہلکا سا لہرایا ، اُسی طرح جیسے انہوں نے اپنے والد کو کرتے ہوئے دیکھا تھا، جس سے مقصد قبولیت ، اور ساتھ ہی الوداعی اشارہ دینے کا تھا ۔ اس اشارے پر بارہ کے بارہ ایک لفظ بولے بغیر پچھلے قدموں چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے ۔ یہ بارہ آدمی ، صاحبزادہ نے سوچا ، آنے والے سالوں میں اُن کے معتمدینِ خاص ہوں گے ، جن پر وہ اپنی جان تک کا بھروسہ کر سکیں گے ۔ کچھ دیر میں ، انہوں نے تصور کیا، باہر احاطے کے بیچ ہزاروں لوگ اسی عمل سے گزریں گے ۔ آج معزز مدعوئیں کی مہمانداری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے گی ۔ پھر چند سال کے اندر ، صاحبزادہ نے اپنے دل میں کہا، میں انہی کے میدانوں میں ان کو پچھاڑ کے رکھ دونگا ۔

بریگیڈئیر (ریٹائرڈ) ارشاد احمد خاں حُجرے سے نکلنے والے آخری شخص تھے ۔ جب باہر نکل کر انہوں نے دروازہ بند کیا تو کمرے کے اندر صاحبزادہ سلامت علی شاہ اکیلے کھڑے رہ گئے ۔ حُجرے میں خاموشی تھی، اور باہر کی دُنیا کو دروازے کے دوسری طرف آباد تھی تاہم بہت دور کے فاصلے پر بستی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ اُس وقت دفعتہ اُن کے دِل سے ہراس کا ایک لرزتا ہوا لحظہ گزرا جس کے اندر انتہا کی قوت، انتہا کی ذمہ داری اور انتہا کے اکیلے پن کا احساس ملا جلا ہوا تھا ۔ ان کے سینے کے اندر یکدم ایک مردنی کا سیاہ پردہ کھنچ گیا ، جس کے اندھیرے میں اُن کی آنکھیں دیکھنے کے قابل نہ رہیں ۔ پھر اس سائے میں آہستہ آہستہ ہلتی سر اُٹھاتی ہوئی زندگی نمودار ہونے لگی ۔ مُردنی کا وہ احساس گزر گیا، گو وہ لمحہ اپنے پیچھے یہ تاثیر چھوڑ گیا کہ سلامت علی کی زندگی پہ اب اس کا سایہ اٹل ہو چکا تھا ۔

اب ایک عجیب سا سرور صاحبزادہ کے دل سے نکل کر بدن میں سرایت کرنے لگا تھا ۔ اُن کا خیال بٹتا گیا ۔ ان پانچ ہفتوں کے اندر انہوں نے جیسے میں بیٹھ کر اپنی ولائت کو (جسے وہ قریبی دوستوں کے حلقے میں اپنی چوٹنی کے نام سے پُکارتے تھے) جدید خطوط پر رضع کرنے کی ٹھان لی ۔ مقصد کے واسطے انہوں نے اپنے دماغ میں کئی منصوبے تیار کئے تھے ۔ اہم منصوبے کے بارے میں بریگیڈئیر (ریٹائرڈ) ارشاد احمد خاں کے ساتھ

2009/08/27 22:09

مختصر بات چیت اِس طرز پر ہو چکی تھی :

صاحبزادے صاحب: پچھلے چند سالوں کے دوران میں سندھ ، بلوچستان اور سرحد کا چکر لگا چُکا ہوں وہاں پہ میں نے دیکھا ہے کہ رُسوخ پیدا کرنے کے مختلف وسائل میں ایک اشد ضروری وسیلہ پیرو کاروں کی تیاری کا ہے ۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

بریگیڈئیر (ریٹائرڈ) : بالکل سر ۔ ٹھیک فرمایا ۔

ص ۔ ص : تو آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں ؟

ب (ر) : سر بالکل متفق ہوں ۔ کسی کا قول بھی ہے کہ طاقت بندوق کی نالی سے پھوٹتی ہے ۔

ص ۔ ص ۔ (مسکراتے ہوئے) : آپ نے کمیونسٹوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟

ب (ر) : سر ملازمت کے دروان کچھ کورسز میں ریفرنس کے طور پر پڑھائی گئی تھی ۔ اس سے زیادہ کا علم نہیں رکھتا ۔

ص ۔ ص : ان کا فلسفہ تو دہریہ خیالات کی بنیاد پر ہے ۔ مگر ان کی پارٹی کی تنظیم لا جواب ہے ۔ ہمیں بُرے لوگوں کی اچھی باتیں اپنانے میں عار نہیں ہونی چاہئیے ۔

ب (ر) : بالکل نہیں سر ۔ اس ضمن میں تو ایک حدیث بھی موجُود ہے ۔

ص ۔ ص : (بات کاٹ کر) : ہمارے کلچر کا انفراسٹرکچر ہزاروں سال پُرانا ہے ۔ اسے قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض اولین ہے ۔

ب (ر) (جوش سے) : بالکل سر ۔ ہمارے کلچر کے مقابلے میں دُنیا کا کوئی کلچر نہیں ٹھہر سکتا ۔ سب دوسرے کلچر بُتوں کے فراموده ہیں ۔ ہمارا کلچر اللہ تعالی کا بخشا ہوا ہے ۔

صاحبزادہ سلامت علی شاہ نے ارادہ کر لیا تھا کہ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر جلد از جلد ایسی تنظیم کا احیاء ہو گا اور اسے بریگیڈئیر (ریٹائرڈ) احمد خاں کی سربراہی میں دے دیا جائے گا ۔

اب وہ ہلکا سا سرور جس کی دھاری اُن کے دل سے پھوٹی تھی آہستہ آہستہ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک اُن کے سارے جسم پہ پھیل چُکا تھا ۔ پھر یکایک جیسے کھٹاک کر کے کوئی پوشیدہ دروازہ کہیں کھلے اُس سرور کی رو کے نیچے نیچے ایک اور لہر اچھال مار کے نکلی اور رواں رواں اس لہر کے اندر صنفِ نازک کے برہنہ بدنوں کا تلذذ گھلا ملا تھا ۔

2009/08/27 22:09

احساس میں، اس تلذذ کے اندر نسرین اور اُس کی ہم ذات قوم کی جانب ایک پُر لطف کدورت کا مادہ شامل تھا جو تلذذ کے اثر کو دوبالا کر رہا تھا ۔ صاحبزادہ سلامت علی کے لبوں پر ایک لطیف مسکراہٹ بکھر گئی ۔ اُنہیں چند روز پہلے کا وہ واقعہ یاد آگیا جب دوکسان، صاحبزادہ کی موجودگی سے بے خبر ، آپس میں باتیں کرتے ہوئے باہر سے گزر رہے تھے ۔

"بیس کاؤں کے اندر جو مٹیار اُٹھتی ہے کہتی ہے صاحبزادہ سلامت علی کے ساتھ سوؤنگی" ۔

انہوں نے دوبارہ قدِ آدم شیشے کے مقابل کھڑے ہو کر ایک نظر اپنے پُورے عکس پہ ڈالی، اور باہر کو چل دیئے ۔ حُجرے کے فرش کا چند قدم راستہ پار کرنے پر صاحبزادہ سلامت علی شاہ ، سجادہ نشین ، گویا اپنے گھر سے نکل کر وطنِ عزیز کی زندگی کا کھیل کھیلنے تک کے سفر کا آغاز کر چکے تھے ۔ دروازہ کھول کر جب اُنہوں نے باہر قدم دھرا تو اُن کے اندر یہ انمٹ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ اُس بچے کے دل نے بالآخر ایک ایسے جادو تک رسائی حاصل کرلی تھی جو سب جادوؤں سے زیادہ قوی اور جاوداں تھا ۔

اُس روز کی ایک اور حکایت بیان کی جاتی ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ اُس دن صبح سویرے مائی سروری نے اپنے لحاف کی گدڑی اپنے اوپر سے اتار پھینکی اور چلا چلا کر اصرار کرنے لگی کہ اُسے نہلایا دھلایا جائے ۔ اس پر صاحبزادہ سلامت علی شاہ کی اماں بھی ، کہ جیسے کوئی نیند سے بیدار ہو جائے، اُٹھ کر اُس کے ساتھ شامل ہوگئیں ۔ پھر وہ دونوں مل کر نہائیں ، نہانے کے بعد اُنہوں نے ایک دوسرے کو نئے کپڑے پہنائے ، بالوں میں تیل ڈالا اور کنگھی کی ۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اُس روز اُن دونوں کے چہروں پر ایک پُر سکون نور تھا کہ نظر نہ ہٹتی تھی ۔ اس حکایت کی صحت کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا ۔ البتہ ایک بات مصدقہ تھی، کہ اُس دن سے مائی سروری نے اُٹھ کر چلنا پھرنا اور اپنے کام کاج کرنا شروع کردیا تھا ۔ کہنے والے یہ بھی کہتے تھے کہ مائی سروری کے سر میں کالے بال اور مُنہ میں نئے دانت نکلنے لگے تھے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

- - - - - - - - - - - - - - - - -

ختم شُد

2009/08/27 22:09
by faisal
oneurdu.com